International Edition
TOUCH OF CLASS
ناول
جل بھی چکے پروانے
عینی ملک
Ainee Malik

جل بھی چکے پروانے

(ناول)

عینی ملک

ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، لاہور

کتاب کمیٹی —— کمیٹی تحریک

ہماری کتابیں آپ کی شعوری عمر میں اضافہ کرتی ہیں

ISBN NO: 978-969-9608-61-2

نام کتاب : جل بھی چکے پروانے (ناول)

مصنفہ : عینی ملک

اہتمام اشاعت : یوسف ثانی (0302-4433499)

مشاورت : قاسم جلالی (عارف والا)

پروف خوانی : جویریہ مُغل (گوجرانوالہ)

اشاعت : اوّل (03 دسمبر 2022ء)

قانونی مشیر : راجہ عبدالجبار خان (0301-4350301)

قیمت : -/700 روپے

مطبع : تایا پریس، ریٹی گن روڈ، لاہور

ناشر : ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، بنک کالونی، سمن آباد، لاہور

0314-4252578 (واٹس اپ)

0300-4191687/0332-4822090

(نوٹ : کتاب کے مواد اور اغلاط کی ذمہ داری پبلشر پر نہیں ہے)

انتساب

اُردو اَدب کے سب سے بڑے ناول نگار

شوکت صدیقی (خُدا کی بستی)

2023 شوکت صدیقی کا سال

(20 مارچ 1923ء (83) 18 دسمبر 2006ء)

کے نام

جو عالمی اَدبی تراجم کی صورت میں

پاکستانی اَدب کا سب سے بڑا نام، وقار اور حوالہ ہیں!

ناول کے نمایاں کردار

1- نور (ہیروئن)

2- بی اماں (نور کی پھوپھی)

3- دیوتا کمار (ہیرو)

4- حاجی بابا (دیوتا کا وفادار ملازم)

5- آسیہ (پُرخلوص دوست اور محنتی کارکن)

انسانیت کی آواز

عینی ملک کا زیرِطبع ناول ''جل بھی چکے پروانے'' انسانیت کی آواز ہے۔اُنہوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اسلام امن و آشتی کا دین ہے۔اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت ہے۔آپ نے اِس موضوع کو اپنے ناول میں نہایت سلیقے اور قرینے سے بیان کیا ہے اور کسی بھی انسان کے ناحق قتل کو انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔یہ ناول کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے بلکہ ادبی انداز میں انسانی نظریہ کی تبلیغ ہے۔

آپ ایک شاعرہ،کالم نویس،افسانہ نگار اور نقادِ ادب ہیں۔اِن کے ذاتی مسلک و مذہب کا اطلاق اِن کے ناول پر انسانی حقوق کے احترام کی صورت میں اُجاگر ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔آج دنیا کو نسلی تعصّبات اور مذہبی منقاشات و تنازعات سے بچانا ہی ذی شعور انسان کا فرض ہے۔مذہبی دہشت گردی نے انسانوں کا سکون برباد کر دیا ہے۔ہر مذہب میں چند مفاد پرست اور مذہب فروش ہوتے ہیں جو روحِ مذہب کو طاق پر رکھ کر انسانوں کا خون بہاتے اور نفرت پھیلاتے ہیں جو کارِ ابلیس ہے۔

محترمہ نے اپنے اِس ناول میں ایک عیسائی خاندان اور ایک بدھ مت کے پیروکار جو کہ کہانی کا ہیرو ہے کی داستانِ المناک بیان کی گئی ہے۔یہ لوگ مذہبی دہشت گردی کا شکار ہوتے ہیں۔مذہب کے نام پر انسانوں کو زندہ جلانا کہاں کا مذہب ہے؟ یہ وہ سوال ہے جسے عینی ملک نے اِس ناول میں اُٹھایا ہے۔محترمہ اُن نام نہاد مذہبی جماعتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں جو مذہب کا نام استعمال کر کے مذہبی دہشت گردی

پیدا کر رہی ہیں اور معصوم لوگوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہیں۔ یہ ناول مقصدیت اور افادیت کے لحاظ سے ایک قابلِ صد ستائش تخلیق ہے جو معاشرے میں امن وامان اور انسانی اقدار اور انسانی حقوق کا آئینہ دار ہے۔ میں عینی ملک کو اِس مثبت اور مفید کاش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مقصود جعفری

29 اکتوبر 2022ء

اسلام آباد

◆◆◆

عینی ملک اور ''جل بھی چکے پروانے''

کسی بھی لکھاری کو جو بات عام افراد سے ممتاز کرتی وہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا واقعہ اور بڑے سے بڑا سانحہ بھی عام آدمی کے لیے "عام" سی بات ہوتی ہے، عام افراد صرف ہڈ بیتی کو سانحہ یا واقعہ سمجھتے ہیں جبکہ لکھاری کسی پر گزرنے اور بیتنے والے حادثے اور سانحے کے اثرات بھی اس حد تک خود پر محسوس کرتا ہے کہ بسا اوقات تو وہ متاثرہ فرد یا افراد سے بھی زیادہ شکست وریخت کا شکار ہو جاتا ہے، کسی اور پر گزرنے والا حادثہ اس کے لیے قیامت ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو معاشرے کے سب سے زیادہ حساس افراد قرار دیا جاتا ہے۔

عینی ملک بھی اسی حساس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو واقعہ یا سانحہ عام افراد کو وقتی طور پر متاثر کرتا ہے اور عام آدمی رفتہ رفتہ اس کے اثر سے باہر نکل جاتا ہے عینی ملک اس واقعے یا سانحے سے چاہ کر بھی باہر نہیں نکل سکتیں۔ ان کے لیے دوسرے پر گزرنے والی مصیبت خود پر گزری قیامت بن جاتی ہے۔ وہ اس قدر حساس ہیں کہ اردگرد کے ماحول میں پیدا ہونے والا ارتعاش بھی ان کی روح کو گھائل کر کے رکھ دیتا ہے۔ خدا کا شکر کہ وہ ایک لکھاری ہیں۔ اپنا غم قرطاس پر منتقل کرنے کے ہنر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اگر مبدہ فیض نے انہیں اس صفت سے محروم رکھا ہوتا اور " کتھارسس" کے اس فن سے مالا مال نہ کیا ہوتا تو وہ بھی میر تقی میر یا شاہ حسین کی طرح گلیوں میں " کر کے تھیا تھیا ناچ" رہی ہوتیں۔ صد شکر کہ وہ اپنی بھڑاس قلم و قرطاس کے ذریعے نکال لیتی ہیں ورنہ وہ بھی فیض احمد فیض کے تتبع

میں پکار اٹھتیں "جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں" ہم اس سے آگے نہیں گز رپائے۔
سانحہِ سیالکوٹ گزر چکا۔ عام آدمی کے لیے وہ تاریخ کا حصہ بن چکا، مگر عینی ملک کے لیے وہ آج بھی اور آنے والے کل بھی ایک قیامت۔مسلسل ہے۔ وہ اس سانحے سے نکل نہیں پا رہیں، اس لیے انہوں نے ایک بار پھر " کتھارسس" کے لیے قلم وقرطاس کا سہارا لیا ہے اور یوں "جل بھی چکے پروانے" منصۂ شہود پر آچکی ہے۔
مجھے قوی امید ہے کہ معاشرے کے سوئے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہوگی۔" جل بھی چکے پروانے" کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم جس شدت کے ساتھ تشدد پسندی کا شکار ہوتے جارہے ہیں، اس سے نکلنے کے لیے ہمیں ایسی کتب کے مطالعہ کی اشد ضرورت ہے۔ عینی ملک پورے ادب قبیلے کی طرف سے مبارکباد شکریے کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اس حساس طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ پیغام دے دیا ہے کہ جب جب قیامت برپا ہوتی رہے گی تب تک پروانے جلتے رہیں گے۔ شاباش عینی، بہت جیو۔

محمد ادریس ناز
چیئرمین ایف ایم نیوز
چیئرمین انٹلکچول فورم پاکستان

◆◆◆

2022 کا اَدبی منظرنامہ

آج کل دنیا میں اقلیتوں کے مسائل روز بہ روز جڑ پکڑ رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر ممالک میں سیاسی اُلٹ پھیر کا سلسلہ ہے جس کے سبب اکثریت خود اپنے مسائل میں غلطاں و پیچاں ہے۔ ایسی اضطرابی کیفیت میں سربراہانِ حکومت کی جانب سے اقلیتوں کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جارہی ہے جس کے نتیجہ میں ترقی پذیر ممالک میں اقلیتوں کا حال بہت بُرا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ اقلیتیں تعلیمی، معاشی و معاشرتی پستی کا شکار ہوکر قعرِ مذلت کی جانب تیزی سے جارہی ہیں۔

اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک میں حد درجہ اضافہ دن بہ دن ہورہا ہے۔ رات دن کے شر و فساد سے لے کر آبادیوں کو تہس نہس کر ڈالنا، عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنا، گھروں و کاروبار کو نذرِ آتش کر دینا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دینا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔

مسلمان ہونے کے ناطے اسلام ہم کو انسانیت کا سبق سکھاتا ہے اور تاریخ ہم کو دوسرے مذاہب کے ساتھ عمدہ سلوک وحُسنِ عمل کی تعلیم دیتی ہے۔ دوسری قوموں کے ساتھ اچھے برتاؤ کے طور طریقے ہم کو قرآن و حدیث سے متفقہ طور پر معلوم ہوتے ہیں مگر یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود کیا بات ہے کہ ہمارا عمل ہمارے علم کے بالکل برعکس ہے۔

ناول نگاری اپنی جگہ اِک قدیم فن ہے جو کبھی قارئ کو فرضی کرداروں کے ساتھ خوابوں و خیالوں کی دنیا کی سیر کرایا کرتا تھا لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا ہے۔ آج کل کی ناول

نگاری مسائل اور حقائق کی ناول نگاری ہے جو انسان کے سوئے ہوئے شعور کو بیداری کا تازیانہ لگاتی ہے اور للکار کر کہتی ہے کہ جاگو، اُٹھو، دیکھو اور غور کرو کہ تم اسلام اور انسانیت کے نام پر کیا عمل کر سکتے ہو جس سے کسی مستحق کو کوئی فائدہ پہنچے اور اسلام سر بلند ہو جائے۔

عینی ملک نے اقلیتوں کے درد کو محسوس کرتے ہوئے اِک نظر انداز کیے ہوئے تلخ موضوع پر بڑی چابک دستی سے قلم اُٹھایا ہے۔ اقلیتوں کے مسائل کا حق پسندگی سے جائزہ لینا اور پھر ایمان و انصاف کو پیش نظر رکھتے ہوئے حقائق کو منظرِ عام پر لانا کوئی آسان بات نہیں لیکن عینی نے بڑی جرأت کے ساتھ ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔

عینی ملک نہ صرف ایک ممتاز کالم نگار، افسانہ نگار، شاعرہ ہی ہیں بلکہ وہ ایک مشاق مضمون نگار، تبصرہ نگار اور ناول نگار بھی ہیں۔ لکھنے لکھانے اور ادارت کا اچھا خاصا تجربہ ہے۔ ادبی خدمات پر بکثرت ایوارڈز اور سر ٹیفیکیٹس حاصل کر چکی ہیں۔ کئی ایک ادبی رسائل او میگزینز میں تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ کئی ادبی شخصیات پر ان کے تحقیقی مضامین شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ عینی کی شخصیت اور فن پر کئی ایک انٹرویوز ادبی دنیا کی زینت ہیں اور بہت سی تخلیقات اُردو آن لائن ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

عینی ملک کی تازہ ترین تخلیق ''جل بھی چکے پروانے'' حالات و حقائق سے بھر پور ایک ایسا سچا سبق آموز ناول ہے جو ہر قدم پر اقلیتی مسائل اور انسانی اعمال کے لئے مشعل راہ ہے۔

ڈاکٹر توفیق احمد انصاری
(شکاگو) امریکہ

◆◆◆

کیتھارسس

ایک وقت تھا کہ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا رجحان ناول کی طرف بہت زیادہ تھا۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب ہر محلے میں ایک آدھ آنہ لائبریری ضرور ہوا کرتی تھی۔ یہاں سے روزانہ ایک آنہ (روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے) کرایہ پر ناول مل جاتا تھا۔سب سے زیادہ جاسوسی ناول پڑھے جاتے تھے تب اشتیاق احمد، ابنِ صفی، مظہر کلیم کے لکھے ناول مقابلے پر ریلیز ہوتے تھے لیکن معاشرتی وسماجی موضوعات پر لکھے ناول بھی بہت پڑھے جاتے تھے بلکہ نسیم حجازی اور دوسرے مصنفین کے تاریخی موضوع پر لکھے ناول بھی اسی شوق وذوق سے پڑھے جاتے تھے۔ہم نے بھی دو ناول لکھے، ایک بچوں کے لئے اور ایک معاشرتی۔ دونوں سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ اب ایک پنجابی کا ناول ''پرتالی'' زیرِ طبع ہے۔

اب ان ناولوں کی جگہ قسط وار ڈراموں نے لے لی ہے کیونکہ اب بہت سے ٹی وی چینل کھل گئے ہیں تاہم ساتھ ساتھ پرانے لکھے ناولوں پر بھی ڈرامے بنائے جا رہے ہیں۔ جہاں ان ٹیلی وائز ہونے والے ڈراموں نے ناولوں کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے وہیں ابھی بھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جو ناول لکھ رہے ہیں اور پڑھنے والے بھی اسی ماحول میں موجود ہیں۔گو مغرب میں تو کبھی ناول نگاری میں کمی آئی ہی نہیں۔اسی کارِخیر میں نوجوان لکھاری بھی اپنا حصہ ڈال رہے ہیں جس کی واضح مثال عینی ملک کی ہے جنہوں نے معاشرتی اور سماجی مسائل پر ''جل بھی چکے پروانے'' لکھ کر اس کارِخیر میں حصہ ڈال دیا ہے۔

عینی ملک معروف افسانہ نگار، شاعرہ، نثر نگار اور تبصرہ نگار ہیں۔ اُن میں ادبی جراثیم بچپن سے ہی پائے جاتے تھے اسی لیے تو فقط بارہ سال کی عمر میں ایک نظم ''اے کاش'' لکھی تو اُنہیں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ اب شاعری، افسانہ نگاری اور کالم نگاری سے آگے بڑھ کر وہ ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ وہ غریب بچوں کی تعلیم کے لئے اپنی مدد آپ کے تحت سرگرم ہیں۔ ٹیلنٹ سے بھرپور عینی ملک نے جلد ادبی اور سماجی حلقوں کی توجہ حاصل کر لی ہے اور متعدد ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں۔

اُن میں لکھنے کی اس صلاحیت کو معاشرے میں اردگرد پھیلے مسائل نے مزید جلا بخشی ہے وہ لوگوں کا دُکھ اور درد ایسے محسوس کرتی ہیں جیسے کہیں خود انہیں ہی چوٹ لگی ہو۔ مختلف فرقہ وارانہ اور مذہبی جماعتوں کی وجہ سے معاشرے میں انسانی تقسیم کو اُنہوں نے بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اُن کا دل اس تقسیم پر بہت کڑھتا ہے۔ پھر ایک لکھاری کے اندر اس قسم کا لاوا اُبلتا ہے تو اُسے بھلا دن رات چین کہاں۔ ایسا لکھاری جب تک کہ اپنا سارا دُکھ لفظوں کی صورت میں کاغذ پر اُنڈیل نہ دے سکون سے سو ہی نہیں سکتا۔ یہی اندر کا دکھ عینی ملک کے ناول ''جل بھی چکے پروانے'' کی آمد کا سبب بنا۔ وہ بھی شہری کی طرح معاشرے میں امن وسکون کی خواہاں ہیں کہ سب مل جُل کر رہیں اور وطن کے لیے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو مثبت صورت میں بروئے کار لائیں۔ دراصل ''جل بھی چکے پروانے'' لکھ کر عینی ملک نے اپنا کیتھارسز کیا ہے۔ ہم اُن کی اس اعلیٰ ادبی کاوش پر اُنہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دُعا گو ہیں کہ اُن کا یہ ناول عوامی سطح پر خوب پذیرائی حاصل کرے۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ
سرجن فیصل مگھیانہ میموریل ہسپتال
گوجرہ روڈ، جھنگ (پاکستان)

خوش آمدید

انسان رب کائنات کی تخلیق میں سب سے افضل و اشرف مخلوق ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں انسان اور انسانیت کو اولیت حاصل ہے۔ زیرِ نظر ناول ''جل بھی چکے پروانے'' اسی موضوعِ سخن پہ محترمہ عینی ملک صاحبہ کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ ہمارے معاشروں میں رائج نام نہاد مذہبی قوتوں کے ضمیر پہ ایک دستک ہے۔ ناول نگار صاحبہ کو خوبصورت اُسلوب میں ایک نازک موضوع پر لکھنے کے لیے میری نیک تمنائیں، ڈھیروں دُعائیں اور مبارکباد۔

دعا گو

ڈاکٹر اروِیندر سنگھ چمک

(ہندوستان)

◆◆◆

NEW WAVE IN URDU FICTION

Annine Malik is a writer of a very high order. As a person she is a good mixer; can take initiative and above all has strong religious convictions. She can well examine social trends and then transforms those trends into her writings. Annie is a keen observer of nature which is the speciality of her writings.

Prof. Sajjad Bhatti
Urdu Department
Murray College Sialkot

انسانیت کا نوحہ

یہ سُن کر واقعی بہت خوشی ہوئی کہ محترمہ اینی ملک انسانیت سے متعلق اپنی کتاب منظرِ عام پر لا رہی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری خطبہ کے مطابق انہوں نے اعلان کیا تھا کہ: ''کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے، نہ کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت سوائے اس کے کہ تقویٰ کے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قابلِ ذکر کتاب یقینی طور پر نئی نسل کو روشن راہ دکھائی گی۔ میں محترمہ اینی کو پوری کمیونٹی کی فلاح و بہبود کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے کی گئی زبردست کوششوں کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد وصی بیگ

چیئرمین

علیگ فاؤنڈیشن، علی گڑھ، اتر پردیش، ہندوستان

انٹرنیشنل بک آف ریکارڈ ہولڈر

لندن بک آف ریکارڈ ہولڈر

◆◆◆

بقلم خود

میرا اصل نام عالیہ ہے۔سب پیار سے عینی کہتے ہیں تو یہی نام میری ادبی دنیا میں پہچان بن گیا۔میرے بابا ملک محمد خالد جو کہ ایک گورنمنٹ سکول کے پرنسپل تھے، اِن کا خواب تھا کہ میں ایم۔فل انگلش کروں چنانچہ اس خواب کی تکمیل کی خاطر اپنی پہلی شاعری کی کتاب ''اے کاش''(2021) کے بعد ادبی سرگرمیوں کو پسِ پشت ڈال کر میں نے اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی۔کبھی کبھار تبصرے، افسانے اور کالم لکھنے کا سلسلہ سمیسٹر بریک کے دوران چلتا رہا۔میری پہلی کتاب جو 2021ء ستمبر میں منظرِ عام پر آئی۔یہ درحقیقت میری بچپن سے لکھی جانے والی نظموں کا مجموعہ ہے۔حتیٰ کہ اس میں میری بارہ سال کی عمر میں لکھی جانے والی نظم ''اے کاش'' بھی شامل ہیں۔میں مانتی ہوں کہ میری کتاب ''اے کاش'' میں بہت سی خامیاں ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ادب کی دنیا میں مختلف موضوعات پر لکھنے سے میرے قلم میں واضح فرق اور پختگی آئی ہے۔جب ادبی حلقوں میں میری نثر نگاری کو خاصی پذیرائی ملی جس بات نے مجھے مزید لکھنے پر اُکسایا۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس طرف توجہ دینا میرے لیے ایک خاصا مشکل امر تھا اس لیے میں نے اپنی اولین فوقیت اپنی تعلیم پر دینے کا سوچا، مگر وہ کہتے ہیں نا کہ ایک لکھاری کبھی بھی اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

تین دسمبر کی ایک سرد دوپہر جب میں اپنی ماما اور بھائی کے ساتھ کہیں سے واپس گھر آ رہے تھے، سڑک پر لوگوں کا ایک شور برپا تھا۔کہیں لوگ احتجاج کر رہے تھے۔یہ

سب حالات وواقعات بتا رہے تھے کہ سیالکوٹ میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہوا ہے۔ بھائی اور میں پریشان تھے کہ ایسے میں بھائی کے دوست کی کال آئی تو بھائی نے اِن سے پوچھا تو بتانے پر پتہ چلا کہ سیالکوٹ میں ایک سری لنکن منیجر کو زندہ جلا دیا گیا ہے۔ گھر آتے ہی نیوز دیکھی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ سچ تھا کہ میرے شہرِ اقبال میں ایک قیامت گزر گئی تھی۔

تین دن یونہی مجھے سنٹر پر گزر گئے ۔ میرا دل سوشل میڈیا پر مختلف ویڈیوز، بیانات اور تصویریں دیکھ دیکھ کر اندر سے کٹ رہا تھا۔ میرا سر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے بڑا سا پتھر میرے سر پر آن رکھا ہو۔ میں نے اس واقعہ کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی مگر میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں کہ میں اس واقعہ پر اظہار خیال کر سکتی۔

پھر میں نے دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر درودوسلام کے بعد جب ہاتھ اُٹھائے تو مجھے بے ساختہ بہت رونا آیا۔ رونے سے جیسا میرا دل ہلکا ہوا تو میں نے اپنی نوٹ بک اور قلم نکال کر لکھنا شروع کیا۔ میں بخوبی آگاہ تھی کہ اس موضوع پر لکھنا آسان نہیں۔ اس لیے میں اس کے لیے پرانتھیا کمار کے بارے میں ریسرچ شروع کر دی۔ ہر نیوز، ایک ویڈیو اور انٹرنیٹ پر موجود ہر خبر کو کھنگال لیا۔ جیسے جیسے میں لکھتی گئی محسوس ہوا یہ موضوع جس کو میں نے پکڑا ہے اس پر لکھنا معمولی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اپنے بھائی ملک علی ذوالقرنین اور اپنے انکل انسپکٹر قلب عباس کی مدد سے متعلقہ تھانے سے پرانتھیا کمار کی ایف۔ آئی۔ آر کی کاپی حاصل کی۔ میں نے اس فیکٹری کے کئی بار وزٹ کیے۔

جب انہوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت نہ دی تو میں نے بتایا کہ میری کتاب ایک تحقیقی مجموعہ ہے اور میں ایک سٹوڈنٹ ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے یونیورسٹی سے اجازت نامہ لانے کا کہہ کر واپس بھیج دیا۔ میں نے یونیورسٹی سے اجازت نامہ لینے کی کوشش کی مگر

پھر مایوسی سے دوچار ہوئی۔ آخرکار یہاں بھی میں نے اپنے بھائی علی کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے فیکٹری کے وزٹ کیے۔

میرے لیے پرانتھیا کمار کی ذاتی زندگی کو جاننا بے حد ضروری تھا چنانچہ اس کے لیے میں نے سری لنکا میں اس کی بیوی Nilushi سے رابطہ کیا۔ پرانتھیا کمار کی زندگی کے مختلف ادوار کو جاننے کے لیے میں نے اس کے دوست وجے سے رابطہ کیا اور کافی کچھ جانا۔ زبان کی بندش کے باوجود انہوں نے میرے ساتھ بہت اچھے طریقے سے معلومات فراہم کی۔ اس سارے سفر میں مجھے بابا کی طرح شفقت سے پیش آنے والے انسان ڈاکٹر عرفان احمد خاں ملے جو کہ میرے لیے اُستاد کا درجہ بھی رکھتے ہیں مسلسل لکھنے کے لیے اُکساتے رہے۔ آخر میں میری ماما جو کہ اس ناول کا اختتام پڑھ کر آبدیدہ ہوگئیں ہمیشہ ہمت بڑھاتی رہیں۔

یہ ناول اُردو ادب کے اندر میری ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اُن تمام لوگوں کے لیے ایک آواز ہے جن کی آواز دنیا کے شور میں دب جاتی ہے۔ میرے الفاظ اگرچہ زبان، ہاتھ اور پاؤں نہیں رکھتے پھر بھی یہ سوئے ہوئے ضمیروں کو جگانے کے لیے کافی ہوں گے۔ آخر میں مَیں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں انشاءاللہ کوشش کروں گی کہ اس کے ہر ایڈیشن کو مزید سے مزید تر بناؤں گی اور اس میں بہتری لاتی رہوں گی۔

عینی ملک

ایم۔ایس انگلش سکالر

◆◆◆

فکشن میں ناول کا مقام

عینی ملک کا پہلا ناول ''جل بھی چکے پروانے'' میرا دوسرا ناول ہے جس کا ''ابتدائیہ'' مجھے لکھنے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے علی عبّاس جلال پوری (معروف ترقی پسند دانشور اور رائٹر) کی دُختر نیک اختر لالہ رُخ بخاری کا ناول: ''جہاں گلزار موسم تھے'' میرے حصے میں آیا۔ ناول نگاری کی ابتداء **1995**ء میں اپنے پہلے ناول ''غازہ خور'' سے کی۔ ''غازہ خور'' جیسا تخلیقی نام **1979**ء میں ہی رکھ لیا تھا، جب میری عمر محض **19** سال تھی۔ یہ عمر جنگ وجدل اور جرنیلی میں تو بڑی معنی خیز ہے لیکن ادب میں کم عمری میں کوئی کوئی آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر (عینی) نے اپنا پہلا افسانہ **Teen Age** ہی میں لکھا تھا۔ وہ ایسا کر سکتی تھیں کیونکہ اُردو زبان اُن کے گھر میں سجاد حیدر یلدرم کی صورت میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ انہوں نے زیرو سے سٹارٹ نہیں لیا تھا۔ قرۃ العین حیدر سے دانستہ یا نادانستہ غلطی سرزد ہوئی کہ اپنا پہلا ہی افسانہ ترقی پسندوں کے خلاف لکھ ڈالا۔ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا انہوں نے اپنے ''اباجی'' کی ڈکٹیشن پر کیا۔ عینی کا پہلا افسانہ ''ادیب'' الٰہ آباد (ہندوستان) میں شائع ہوا تھا۔ حجاب امتیاز علی معروف ڈراما نگار امتیاز علی تاج کی زوجہ محترمہ نے بھی اپنا پہلا افسانہ ''میری ناتمام محبت'' اوائل عمری ہی میں لکھا جو حکیم احمد شجاع کے اَدبی جریدے ''نیرنگ خیال'' میں طبع ہوا۔ اسی طرح ینگ رائٹرز خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور نے بھی **Teen Age** میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے والد احمق پھپھوندی شاعر تھے اور بھائی خالد احمد بھی شاعر تھے۔

خالد احمد ''فنون'' کی ادارت میں شامل رہے اور پھر اپنا اَدبی جریدہ ''بیاض'' نکالا جو اُن کے مرنے کے بعد آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ عینی آزاد خیال لڑکی تھی۔ ماں باپ کے کہنے پر

کہاں چلتی ہوگی۔ مونہہ اُٹھا کر پاکستان چلی آئی۔ مشہور پاکستانی اُردو فوجی رائٹر بریگیڈیئر شفیق الرحمٰن سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر وہ نہیں مانے۔ قدرت اللہ شہاب اَز خود عینی پر بھونڈ ہو گئے مگر عینی نے اُنہیں ''ناٹے قد'' کا کہہ کر مسترد کر دیا۔ خود پسند، نک چڑھی، بدمزاج خاتون تھی۔ پاکستان میں قیام کے دوران اپنا مشہور ناول: ''آگ کا دریا'' لکھا جو ''ادب برائے ادب'' تھا یعنی ترقی پسندوں کے سلوگن: ''اَدب برائے زندگی'' کی ضد۔ ضد اَنا پرستی کی ایک صورت ہوتی ہے جو عورت میں زیادہ ہوتی ہے۔ ہندی میں 3 ''ہٹ'' یعنی ''ضد'' بہت مشہور ہیں:

-1 تریاہٹ (عورت کی ضد)
-2 بالک ہٹ (بچے کی ضد)
-3 مُلاہٹ (مولوی کی ضد)

عینی کو شوکت صدیقی جیسے ترقی پسند کے ناول: ''خُدا کی بستی'' سے پالا پڑ گیا جو اُس پر بھاری پڑا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی شرمندگی ایسے مٹائی کہ شوکت صدیقی کے ناول: ''خُدا کی بستی'' کو انعام دینے والی جیوری کی جج بن گئی۔ اس طرح اُس کا ناول ''آگ کا دریا'' خود بخود مقابلے کی دوڑ سے خارج ہو گیا۔ پاکستان کا پہلا ''آدم جی اَدبی ایوارڈ'' شوکت صدیقی کے نصیب میں آیا۔ ''خُدا کی بستی''، ''آگ کا دریا'' اور ''اُداس نسلیں'' آگے پیچھے ہی طبع ہوئے تھے اور اُن کا نام آج بھی لیا جاتا ہے۔ ان 3 ناولوں کا بنیادی فرق جاننا آج کے قاری اور طالب علم کے لئے اَز حد ضروری ہے۔ گدھا، گھوڑا برابر نہیں کیا جا سکتا۔ ''خُدا کی بستی'' دیسی گھوڑا ہے اور ''آگ کا دریا'' اور ''اُداس نسلیں'' اَڑیل ٹٹو۔ ''آگ کا دریا'' کا مرکزی خیال ہرمن ہیسے کے ناول ''سدھارتا'' (نوبل انعام یافتہ) سے لیا گیا۔

''سدھارتا'' دہی تھا، عینی نے اُس کی کچی لسّی بنا ڈالی۔ ''آگ کا دریا'' کے بعد آنے والے ناول: ''اُداس نسلیں'' پر خود قرۃ العین حیدر نے الزام لگایا کہ اُس کے 100 صفحات اُس کے ناول: ''آگ کا دریا'' سے اُٹھائے گئے ہیں۔ یہ الزام عبداللہ حسین پر ثابت ہوا یا نہیں ہوا؟ ''اُداس نسلیں'' کے بارے میں یہ بات سب کو پتہ ہے کہ یہ نام ''سویرا گروپ'' کے مردِ آہن محمد سلیم الرحمٰن کا تجویز کردہ ہے اور انہوں نے ہی اس ناول کے لئے ''سویرا بیوٹی پارلر'' میں بیوٹیشن

والی خدمات بھی سرانجام دی تھیں۔ یادر ہے ''آگ کا دریا'' اور ''اُداس نسلیں'' کے پبلشر (قوسین سویرا گروپ) ریاض احمد تھے۔ شوکت صدیقی نے بھی ہندوستان سے لاہور بذریعہ پرمٹ ہجرت کی تھی۔ کچھ عرصہ لاہور گزارا اور سویرا میں بھی چھپے۔ پھر وہ مزید آگے یعنی کراچی چلے گئے۔ لاہور میں قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کے لئے میدان صاف ہوگیا مگر وہ اپنی گھٹی ہوئی سوچ کے باعث مل کر بھی شوکت صدیقی کے برابر نہ آسکے کیونکہ وہ ترقی پسند نہیں تھے۔ شوکت صدیقی کے ناول ''خُدا کی بستی'' پر دوبار توٹی وی ڈراما بنا۔ کام یہاں پر ہی ختم نہ ہوا۔ ترقی پسندی تو بڑی دور تک مار کرتی ہے جناب! پہلے کراچی میں ''خُدا کی بستی'' کے نام سے ایک بستی تعمیر کی گئی۔ پھر کوٹری میں اسی نام کی بستی بسائی گئی اور لاہور کے مضافات میں مرید کے کے پاس بھی راقم نے ''خدا کی بستی'' دیکھی، جس سے ثابت ہوا کہ یہ ''ادب برائے زندگی'' ہی تھا جو لوگوں کی زندگیوں میں شامل ہو گیا۔ ''آگ کا دریا'' کے نام سے دنیا کا کوئی دریا (گوگل سرچ) نہ ملا نہ ہی کوئی دریا یہ نام رکھنے پر تیار ہوا۔ جب ''اُداس نسلیں'' کے اثرات کی تلاش کی تو وہاں بھی نتیجہ مزید مایوس کن نکلا۔ کوئی تعمیراتی کمپنی (بشمول بحریہ ٹاؤن) ''اُداس نسلیں اپارٹمنٹس'' تعمیر کرنے پر خود کو آمادہ نہ کرسکی۔ اس طرح یہ نام ''ہوائی نام'' ثابت ہوا۔ شوکت صدیقی کی عظمت کا سفر تمام نہیں ہوا۔ ''خدا کی بستی'' دنیا کی **47** زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ''خدا کی بستی'' کو عالمگیریت شوکت صدیقی نے ایسے عطا کی کہ ناول میں ''کراچی'' لکھنے کی بجائے ''ایک ساحلی شہر'' لکھ دیا۔

یوں اسے پڑھنے والے دنیا بھر کے ساحلی شہروں کے باسیوں نے اپنی ہی کہانی سمجھا۔ شوکت صدیقی نے کراچی میں مجھے ایک ہفتے تک اپنا مہمان رکھا۔ اس دوران انہوں نے بتایا کہ انہیں ''خُدا کی بستی'' کے اگر پیسے نہیں ملے تو وہ اُردو، ہندی، بنگالی اور چینی ایڈیشن تھے باقی تمام دنیا سے اُنہیں بن بتائے رائلٹی کے چیک موصول ہوتے ہی رہے۔ اتفاق سے سال **2023**ء شوکت صدیقی کا سال ہے۔ (پیدائش : **20** مارچ **1923**ء (لکھنؤ وفات : **18** دسمبر **2006** (کراچی)

تمام ترقی پسندوں پر لازم ہے کہ وہ شوکت صدیقی کے احترام میں باادب کھڑے ہو جائیں اور سال **2023**ء کو شوکت صدیقی کے شایانِ شان منانے کی تیاریاں ابھی سے شروع

کر دیں۔ شوکت صدیقی کے قریب ترین حریف (قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین) اُن کے مقابلے میں کیسے پسپا ہوئے؟ یہ موضوع بھی بڑا دلچسپ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی نک چڑھی طبیعت کے باعث شادی ہی نہیں کی اور عبداللہ حسین جن کی عقل اپنے لمبے قد کے باعث، اُن کے ٹخنوں میں تھی اُنہوں نے **75** سال کی عمر میں اپنی بیوی کو طلاق دے کر خود کو ہتل کر لیا۔ اُن کی ایک ہی بیٹی ہے جو عینی ہی کی طرح لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ شوکت صدیقی ترقی پسند ہونے کے باعث اکثر تھانے بلائے جاتے تھے مگر جب اُنہوں نے میجر کی بیٹی سے شادی کر لی تو تھانے والے بھی انہیں بلانے سے تائب ہو گئے۔ یوں شوکت صدیقی اَزدواجی زندگی کے میدان میں بھی اپنے حریفوں کے مقابلے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔

شوکت صدیقی کے فن اور شخصیت پر تو دنیا بھر میں باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ اب میں اُردو فکشن کے **TOPPERS** کے نام اپنے علم اور سچائی کی روشنی میں آپ کو بتانا چاہوں گا :

- ناول : شوکت صدیقی
- ناولٹ : رحمٰن مذنب
- افسانہ : سعادت حسن منٹو

اب ہم فکشن پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ عالمی اَدب شعری یا نثری اَدب پر مشتمل ہوتا ہے۔ نثری اَدب میں فکشن برتری رکھتا ہے اِس طرح یہاں بھی اَدب کے **2** حصے ہو جاتے ہیں۔ فکشن اور نان فکشن۔ فکشن کے نمایاں ترین درجے یہ ہیں :

1- افسانچہ **(MICRO FICTION)** یہ ایک لائن سے **100** الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ آپ نے روزنامہ ''جنگ'' میں ''**100** الفاظ کی کہانی'' دیکھی یا پڑھی ہو گی۔ یہ فکشن کی ابتداء یعنی پہلا درجہ ہے۔ اسے ہم فکشن کا بیج بھی کہہ سکتے ہیں۔

2- افسانہ **(SHORT STORY)** افسانہ **2** یا **3** صفحات سے لے کر **30/35** صفحات پر مشتمل ہوتا ہے لیکن لوگ بھول جاتے ہیں کہ کہانی اور افسانے میں بھی فرق ہے۔ کہانی تو انگریزی سے آئی ہے مگر اَفسانہ مقامی ہے۔ کہانی سیدھی سیدھی ہوتی ہے گنے کے رس کی طرح۔ مگر جب فروٹ جوس کو پراسیس کر کے، خوبصورتی کے ساتھ ڈبے میں پیک کیا جائے تو

وہ افسانہ کہلاتا ہے۔ میں اسے تین پہیوں والی بچوں کی سائیکل اور اتھلیٹکس میں **100** میٹر والی دوڑ بھی کہتا ہوں۔ میں منٹو کا عاشق ہوں اس لئے منٹو کی خاطر ایک قربانی بھی دی۔ افسانہ سرے سے لکھا ہی نہیں۔ میرے ناولوں کے قارئین اگر مجھے ''منٹو ثانی'' کہتے یا سمجھتے ہیں تو یہ اُن کی مہربانی ہے۔ میں نے کبھی خود کو منٹو ثابت کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک مضمون میں مشہور ناولٹ نگار رحمٰن مذنب کا تقابل سعادت حسن منٹو سے کر کے رحمٰن مذنب کیلئے مشکلات کھڑی کر دیں۔ رحمٰن مذنب میرے ہمسائے اور محسن تھے۔ اُن کو **2017**ء میں اپنے پی ایچ۔ ڈی مقالے کے ذریعے اُردو کا سب سے بڑا ناولٹ نگار ثابت کر دیا۔ یہی میرے مقالے کی اہم ترین دریافت بھی ثابت ہوئی۔

-3 ناولٹ **(NOVELETTEE)** **35/40** صفحات سے لے کر **100** صفحات تک کا ہوتا ہے۔ یہ صنف فرانسیسی سے اُردو زبان میں شامل ہوئی۔ اس کے اصل معنی: ''ناول کا بچہ'' یا ''چھوٹا ناول'' کے ہیں چونکہ اس موضوع پر میں **Ph.D** کر چکا ہوں اس لیے یہ کہتا ہوں کہ ناولٹ میں یہ خوبی موجود ہے کہ اسے بڑھا کر آنے والے وقت میں فکشن رائٹر ناول بنا سکتا ہے یعنی یہ بچہ بڑا بھی ہو سکتا ہے اور جوانِ رعنا بھی بن سکتا ہے۔ شوکت صدیقی نے اپنا شہرۂ آفاق ناول: ''خدا کی بستی'' پہلے ناولٹ ''خداداد کالونی'' ہی کی صورت میں لکھا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اولین سفرنامے ''نکلے تری تلاش میں'' کے **2** ابواب: ''اپاہج وینس'' اور ''جپسی'' کو بعد میں ناول کی شکل دے دی۔

-4 ناول: ناولٹ کے بعد فکشن کا آخری اور سب سے بڑا پڑاؤ ناول کہلاتا ہے۔ یہ **100** صفحات کے بعد شروع ہوتا ہے اور ہزاروں صفحات تک جا سکتا ہے۔ یہی کسی بھی فکشن رائٹر کی آخری منزل ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ اَدبی نوبل پرائز اور دیگر اَدبی انعامات ناول نگاروں ہی کو ملے ہیں۔ پاکستان میں آجکل ناول کے عروج کا زمانہ چل رہا ہے۔ اُردو اَدب میں شاعری اور افسانہ اپنا عروج دیکھ چکے ہیں۔ ناول اور ڈراما نے ابھی مزید آگے جانا ہے۔ ڈراما اُردو اَدب میں برائے نام لکھا گیا۔ انگریزی میں شیکسپیئر تن تنہا ڈرامے کی صنف میں اتنا بڑا کام کر گیا کہ وہ آج بھی دنیا کے **3** بیسٹ سیلر رائٹرز میں شامل ہے۔ ڈراما کو انگلستان کی سرزمین بڑی راس

آئی۔ پاکستان سے ضیاء محی الدین اور طلعت حسین، ڈراما انگلینڈ سے ہی لے کر آئے۔ عثمان پیر زادہ (پیرزادہ فیملی) کے والد رفیع پیرزادہ بھی ڈراما انگلستان سے ہی سیکھ کر آئے اور پاکستان میں اس کو فروغ دیا۔ فکشن کے بعد نان فکشن کی باری آتی ہے۔ نان فکشن کی **3** نمایاں ترین اصناف یہ ہیں :

1- آٹو بائیوگرافی **2-** بائیوگرافی **3-** سفرنامہ

آٹو بائیوگرافی میں رائٹر خود اپنے حالات زندگی یا جگ بیتی لکھتا ہے اور ایسا اپنے جیتے جی کر گذرتا ہے۔ ''شہاب نامہ'' قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد شائع تو ہو مگر شہاب نے اپنی زندگی میں ہی اُس کا مسودہ فائنل کر کے بنک لاکر میں رکھوا دیا تھا۔

بائیوگرافی میں کوئی اور رائٹر کسی بڑی شخصیت کے بارے میں اُن کی زندگی میں یا اُس کے مرنے کے بعد لکھتا ہے۔ سچا ترین علم یا **FIRST HAND KNOWLEDGE** تو ہمیں صرف اور صرف آٹو بائیوگرافی ہی میں ملتا ہے۔ بائیوگرافی میں ہمیں سیکنڈ ہینڈ نالج ملتا ہے۔ سفرنامے کا مقام نان فکشن میں تیسرے درجے کا ہے۔ سفرنامے کو تیسرا درجہ عطا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ مستنصر حسین تارڑ کا ہے۔ لوگ موت کا وقت قریب دیکھ کر سچ بولنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ''جھوٹ کا دیوتا'' مستنصر حسین تارڑ ایسا کیوں کرے گا؟ اس لئے بہت سے رائٹرز بہت سے سفر کرنے کے باوجود محض ''تارڑ گردی'' کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، سفرنامہ لکھنے سے باز رہے۔

جب ناول کی بات چل ہی پڑی ہے تو یہاں ایڈیٹر ''ساقی'' دِلّی شاہد احمد دہلوی کا ایک درد بھرا بیان سُن لیں: ''میں نے اپنے وقت کی بڑی اَدبی شخصیات کرشن چند، سعادت حسن منٹو اور فیض احمد فیضؔ کو ناول لکھنے کیلئے پُرکشش رقم ایڈوانس دی، نتیجہ کیا نکلا؟ سعادت حسن منٹو ایڈوانس لے کر کھا گیا اور کوئی ناول لکھ کر نہیں دیا (یاد رہے سعادت حسن مَنٹو نے صرف ایک ناولٹ: ''بغیر عنوان کے'' لکھا تھا جو میرے پی ایچ۔ ڈی مقالے میں شامل ہے) فیض احمد فیضؔ نے **6** ماہ بعد ایڈوانس واپس کر دیا اور ناول لکھنے سے معذرت کر لی کہ یہ اُن کے بس کا کام نہیں۔ صرف ایک نر آدمی نکلا وہ تھا: کرشن چندر جو شاہد احمد دہلوی کا دیا ہوا ایڈوانس لے کر کشمیر چلا گیا اور وہاں سے

واپسی پر ناول: ''شکست'' کا مسودہ شاہد احمد دہلوی کے حوالے کیا۔ تو میرے پیارے قارئین اور شاگردانِ عزیز ناول لکھنا بہت مشکل کام ہے جس پر اللہ کی مہربانی سے آسان ہو جائے تو ہو جائے۔ اس پر افسانہ نگاروں کو جلنے کُڑھنے کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی نوبل پرائز لینے کے چکر میں ناول لکھنے کی کوشش کی مگر نڈھال ہو گئے۔ قلم اَڑیل ٹٹو بن کر رہ گیا۔ ڈراؤنی ڈراؤنی سی اشکال نظر آنے لگی تھیں دونوں بزرگوں کو ناول لکھتے ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی کو تو منصورہ جیسی ''سیامی ہتھنی'' ڈراتی تھی اور ڈاکٹر وزیر آغا ستلج بلاک والے ڈاکٹر انور سدید کو تصور میں لا کر سہم سے جاتے تھے اور قلم اُن کے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ ان بزرگوں کے بعد میرے اُستادِ محترم ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنا ناول: ''انارکلی'' آخر کار لانے کی ہمت کی وہ بھی میرے پُر زور اصرار پر۔ بقول مرزا صاحب اُنہوں نے اس ناول پر اپنے **36** برس صرف کیے۔ آخر کار ''انارکلی'' نامی یہ بچی بڑے آپریشن سے پیدا ہو گئی۔ ''بڑا آپریشن'' بڑا معنی خیز لفظ ہے یہاں۔ اس کو ناول کی زنانہ قارئین زیادہ شدت سے محسوس کر سکیں گی۔

عینی ملک کے ناول: ''جل بھی چکے پروانے'' کا یہ مقدمہ تو الطاف حسین حالی کے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' جیسا بننے چلا تھا۔ میں نے اس دیسی گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے جان بوجھ کر مزید آگے نہیں جانے دیا۔ اب میں آتا ہوں ایک بار پھر اس ناول کی طرف۔ اس ناول کا مرکزی کردار وہ مظلوم سری لنکن منیجر **(PRIYANTHA KUMARA GIYAWARGA)** ہے جس نے اس حرام خوری اور ہڈحرامی پر مائل قوم کو اپنے پیشہ ورانہ فرائض ایمانداری اور پوری دیانت داری سے سرانجام دینے کی بارہا تلقین بھی کی تھی اور عملی طور پر مرتے دم تک اسی کے لیے کوشاں رہا۔ میں تو اُسے ''شہید'' ہی کہوں گا کیونکہ وہ مسلمان ہو چکا تھا مگر اُس نے اپنی ''مسلمانی'' کی نمائش نہیں کی تھی یا پھر وہ کسی مناسب وقت کا منتظر تھا۔ دلوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔ جانے والا تو چلا گیا مگر جاتے جاتے ہمارے مذہبی معاشرے کے حوالے سے اَن گنت سوالات چھوڑ گیا۔ یہ سب سوالات انسانیت کے حوالے سے ہیں۔ انسانیت سے خالی دنیا کا کوئی بھی مذہب نہیں۔ سب سے پہلے انسانیت اور بعد میں سب کچھ۔ انسانیت کے حوالے سے میں نے ایک تمثیلی منظر اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے۔ آپ سب کے ساتھ یہاں شیئر کرنا

مناسب ترین خیال کرتا ہوں۔شاید کئی سال پہلے یہ منظر میرے ذہن میں اسی ناول کے لیے تخلیق ہوا تھا۔منظر کچھ اس طرح سے ہے: ''آپ شدید سردی میں جب دُھند ہی دُھند ہر طرف چھائی ہوئی ہے، گھر سے باہر نکلتے ہیں۔آپ کو اپنے گھر سے کچھ دُور سڑک پر کوئی گرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپ جبلی طور پر بے ساختگی میں آگے بڑھتے ہیں۔اُس وقت آپ یہ بالکل نہیں سوچتے کہ یہ مرد ہے یا عورت یا پھر تیسری جنس۔اس کا مذہب کیا ہے؟ اس کا مسلک یا فرقہ کیا ہے؟ اس کی زبان یا قومیت کیا ہے؟ آپ صرف اور صرف انسانیت کے ناطے گرے ہوئے کو اُٹھانے کی نیک نیّت سے آگے بڑھتے ہیں۔تو افضل ترین کیا ہوئی؟ انسانیت! جو بھی انسان انسانیت سے گر جائے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ایسے سانحے بھول جانے والی اقوام بے حس کہلاتی ہیں۔ **80** ہزار انسان (زیادہ تر مسلمان) ایک ساتھ مرنے کا واقعہ بھوپال (ہندوستان) میں ہی ہوا تھا۔امریکی کیمیکل کمپنی **(UNION CARBIDE)** کے مرکزی پلانٹ سے زہریلی گیس کا اخراج شروع ہو گیا۔چشمِ زدن میں ہزاروں نفوس موت سے دوچار ہو گئے۔ ہندوستان یہ معاملہ عالمی عدالت میں لے تو گیا مگر وہاں امریکی کمپنی کا اثر ورسوخ کام کر گیا جس کا بجٹ اور اثاثہ جات ہندوستان کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کافی تھے۔یوں یہ معاملہ عدالت سے باہر ''خفیہ'' طریقے سے حل کر لیا گیا اور ہندوستان میں کسی نے ''چوں'' بھی نہیں کی۔اکثریت نے سوچا ہوگا کہ مرنے والوں کی اکثریت چونکہ اقلیت سے تھی اس لیے ہم سب کا ''چپ'' ہی رہنا بہتر ہے۔

پریانتھا کمارا کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔سری لنکا، پاکستان کے قریبی اور دوستما لک میں نمایاں ترین ہے۔سری لنکا نے پاکستان کو آنکھوں کے عطیات بڑی دریا دلی سے دیئے۔یہ تو ہم پاکستانی ہی نکمے اور جاہل تھے جو آنکھوں جیسے قیمتی تحفے کی قدر ہی نہ کر سکے۔**PIA** سری لنکا سے یہ عطیات **FREE OF COST** پاکستان لاتی تھی لیکن پاکستانی وہ **CONTAINERS** واپس کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے تھے جن میں یہ آنکھیں آتی تھیں۔ پاکستان نے سری لنکن کرکٹ کو عالمی سطح پر لانے کے لئے بڑا ساتھ دیا۔سری لنکا کی اعلیٰ ترین چائے مشہور ادیب اے۔حمید صاحب نا صرف خود شوق سے پیتے تھے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی پلاتے تھے جن میں راقم بھی شامل تھا۔سری لنکن افواج پاکستانی اسلحہ استعمال کرتی ہیں اور

سری لنکن فوجیوں کی تربیت بھی پاکستان میں ہوتی ہے۔ان تعلقات کے پیشِ نظر ایک معزز سری لنکن شہری کے ساتھ غیر انسانی سلوک پوری پاکستانی قوم کے لیے باعثِ شرم تھا۔سیالکوٹ ہی کی عینی ملک نے خود کو اس درد میں ڈوبا محسوس کیا اور اس درد کو پوری دنیا سے ناول کی صورت میں شیئر کرنے کا عزم کیا۔اُس نے مجھے اُستاد مانا اور میں نے اُسے اپنی شاگرد/بیٹی تسلیم کیا۔یہ باتیں ذہنی طور پر طے ہونے کی دیر تھی اللہ نے ہم دونوں کے دماغ مثبت اَدبی انداز میں متحرک کر دیے۔ ناول کے بارے میں مشورے ہونے لگے۔ہم پاکستان کو ایک گھٹا ہوا ملک اپنے دشمنوں کی باتوں میں آ کر تصور تو کرنے لگتے ہیں مگر جب ہم عالمی سطح پر دوسرے ممالک کے معاملات دیکھتے ہیں تو پھر ہمیں پاکستان کئی لحاظ سے بہتر بھی لگنے لگتا ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ آبادی پر مؤثر کنٹرول، تعلیم کا **100%** کی سطح تک لے جانا اور قومی صحت کو مثالی بنانا ہے۔آبادی کے لحاظ سے ہم ایک بے لگام اور نامعقول قوم کا درجہ رکھتے ہیں۔تعلیمی کھاتوں میں ہم نے عربی کا ابتدائی قاعدہ پڑھنے والے کو بھی ''خواندہ'' درج کر رکھا ہے اور صحت کے اعداد و شمار (حقیقی) دیکھے جائیں تو ہم ایک ''بیمار قوم'' قرار پاتے ہیں۔ بیمار قوم نہ اپنے لیے کچھ کر سکتی ہے نہ کسی کے لیے۔ برطانوی سٹیج ایکٹر اور رائٹر مائیکل پلین نے **BBC** کے لیے بنائی گئی ٹیلی ویژن سیریز اور کتاب: **"AROUND THE WORLD IN 80 DAYS"** میں سعودی عرب کے بارے میں ایک ذہانت سے بھرپور جملہ لکھا جسے میں نے کئی سال قبل پڑھا مگر یہ جملہ آج بھی میرے ذہن پر ثبت ہے: **''سعودی عرب دیکھنے میں امریکہ جیسا اور برتاؤ میں روس جیسا''** کسی ملک کو ایک جملے میں ایسے سمیٹ سکتا ہے کوئی؟ امریکہ کی قومی پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہالی وڈ کی کسی فلم میں بھی آپ کو امریکی جھنڈے کے علاوہ کسی اور ملک کا جھنڈا قطعاً نظر نہیں آئے گا۔

عینی ملک نے اس ناول کے مرکزی کردار دیوتا کمار کو جس طرح خود پر طاری کیا وہ لائقِ داد ہے۔عینی ملک جس طرح کم عمری ہی میں کتابیں لکھ رہی ہیں تو اُن کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی بآسانی کی جا سکتی ہے۔اُن میں آگے بڑھنے کی لگن ہے کسی حد تک زبان کی کمزوری بھی (شاید اس لیے کہ وہ **ENGLISH LITERATURE** کی طالبہ ہیں) مگر وہ اُردو کی یہ کمی ٹیوشن رکھ کر بھی پوری کر سکتی ہیں۔لتا منگیشکر اگر مراٹھن ہو کر اپنا اُردو شین قاف دُرست (لتا

نے اس کام کے لئے ایک مسلمان مولوی صاحب کوبطور ٹیوٹر رکھا تھا) کرسکتی ہے تو عینی ملک کے لئے ایسا کرنا کون سا مشکل ہے؟ کسی زمانے میں بڑے اُردو مراکز لکھنؤ اور دِلّی تھے مگر اب لاہور اور کراچی ہیں۔ سیالکوٹ لاہور سے زیادہ دور نہیں۔ عینی ملک کی مزید خوش قسمتی کہ سیالکوٹ شہر میں روح الامین جیسی بلند مرتبہ علمی و ادبی شخصیت رونق افروز ہیں۔ عینی اُن سے رابطہ کریں اور اپنی اُردو (لکھنے کی حد تک) مزید بہتر بنائیں۔ اُن کی تخلیقی پرواز اور وَفور کا تو میں بھی معترف ہوں مگر اُن کے آگے ابھی ایک لمبا سفر پڑا ہے۔ یہ ناول مارکیٹ میں آنے کی دیر ہے ریڈرز اُن کے دیوانے ہوجائیں گے۔ بے شک اُن میں اکثریت **TEEN AGERS** ہی کی کیوں نہ ہو مگر فرق تو ضرور پڑے گا۔ ہر دَور اپنے ہیرو اور ولن ساتھ لے کر آتا ہے۔ اس ناول کا قاری ناول میں بیان کی گئی لوسٹوری میں کھو کر رہ جائے گا۔ شروع میں یہ ناول قاری کو خواب آور گولی جیسا گا مگر ناول کے اختتام پر جب عینی ملک بے حس معاشرے کو عظیم ترین باکسر محمد علی کی طرح پہ در پے پہ گھونسے ماریں گی اور لیلیٰ علی (محمد علی باکسر کی باکسر بیٹی) بن جائے گی تو ناول اصل میں ناول بن جائے گا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوجائیں گے۔ یہ وہ آنسو ہوں گے جو ہم سب انسانیت کے ناطے بہائیں گے اور ہماری روح شانت ہوجائے گی۔ رہے نام اللہ کا!

ڈاکٹر عرفان احمد خان

پنجاب یونیورسٹی، نیو کیمپس لاہور

10۔ اکتوبر 2022ء

(محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی پہلی برسی)

0300-4191687

0332-4822090

0314-4252578 (واٹس اپ)

◆◆◆

باب 1

جنوری کا اوائل تھا سردی پہلے سے قدرے بڑھ چکی تھی۔ باہر دھند کا جوبن اپنے عروج پر تھا۔ ٹھنڈی یخ بختہ ہوائیں سردی کی شدت کو مزید بڑھا رہی تھیں اور دھند کا دھندلکا تھا اور باغ کی بھینی بھینی خوشبو سے سارا صحن مہک رہا تھا۔ سیالکوٹ میں اِن ایام میں اسی طرح سردی پڑتی تھی مگر اس سال معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

میں بہت دیر تک لیٹی ہوئی اپنے کمرے سے صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے دُھند کے گہرے دھندلکے میں سے چاند کو ڈھونڈ رہی تھی مگر چاند تھا کہ نظر آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میری نظریں چاند کی تلاش میں ہمیشہ تشنگی اور اضطرابی کیفیت کا شکار رہی۔ بہت دیر تک چاند کو بادلوں میں نہ پا کر ہمیشہ کی طرح میں نے اپنا قلم اور رائیٹنگ پیڈ جو کہ سائیڈ ٹیبل پر ہر وقت موجود رہتا تھا اُٹھا کر لکھنا شروع کیا:

کہاں ہو تم میرے چاند
میرا دل اکیلا ہے
نہیں ممکن امکان اب تیرے آنے کا
یہ دُکھ بھی دل نے جھیلا ہے
نہ جانے کیوں میری پاگل آنکھیں
تیرے دیدار کو ترسیں
میرا تو ایک ہی سہارا ہے
کہاں ہو تم میرے چاند

میرا دل اکیلا ہے

لکھتے لکھتے جانے کب مجھے نیند آ گئی اور قلم ہاتھ میں لیے میں اس دنیا سے نکل کر دُور کہیں خوابوں میں غوطے کھانے لگی۔

صبح جب بی اماں نے مجھے آواز لگائی: ''نور! اُٹھ جا میری بچی۔''

درخشاں نور نیند سے یکدم اُٹھنے والے جھٹکے سے دوچار ہوئی۔ نیند سے اُٹھنے والے اس جھٹکے کا مجھے ہر روز یونہی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بہرحال ہوش سنبھالتے سنبھالتے کہا:

''جی بی اماں''

''بی اماں گویا ہوئیں اُٹھ جا میری چندا تمہیں پتا ہے نا میں نے آج درزی کو کپڑے دینے جانا ہے اور تم میرے آنے سے پہلے سبزی چڑھا دینا تیری ماں فیکٹری چلی گئی۔'' بڑی اماں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔ میں نے بھی بددلی سے ''ہاں'' میں سر ہلا دیا۔

بی اماں کے جانے کے بعد میں اپنے سر کو اپنے گھٹنے پر رکھے رات کو آنے والے خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ مگر اس خواب کو سمجھنے سے قاصر رہی۔

کبھی کبھی ہم اس اضطرابی کیفیت کا شکار ہوتے ہیں جب بے بسی انتہا کی ہوتی ہے۔ ہم چاہ کر بھی نہ تو اس کیفیت کو خود جان پاتے ہیں اور نہ ہی دوسرے کو بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ ہوتے ہیں۔ ہمیں خود کو خود ہی دھکا لگا کر اس حالت سے گھسیٹنا ہوتا ہے اور خود کو بتانا ہوتا ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں آئے گا ہمیں بچانے کے لیے۔

دوپہر کا کھانا بنا کر ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں پہچان گئی یہ اماں ہے۔ کیسے نہ پہچانتی اماں روز اس ٹائم پر دس سال سے دستک دے رہی تھی اور اماں نے بابا کے جانے کے بعد فیکٹری میں کام کر کے میری پڑھائی اور گھر کا خرچہ اُٹھایا تھا۔

امی آپ آ گئیں؟'ہاں بیٹا پانی پلا تھوڑا سا۔'

میں نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے ان کی کمزور جسمانی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے بے بسی سے دیکھا۔اندر کہیں ٹوٹ پھوٹ ہوئی مگر مجھے اظہار نہیں کرنا آتا تھا۔

مگر آج امی کی یہ حالت دیکھ کر خفگی اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ امی کہ کہہ ڈالا:

''امی اب سے میں فیکٹری میں کام کروں گی آپ کی جگہ۔میرے پڑھنے کا کیا فائدہ اگر میری ماں اس عمر میں بھی کام کرے۔'' امی نے کہا''نہیں بیٹا میں کبھی نہیں ہونے دوں گی تو میری ایک ہی بیٹی ہے۔''امی نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا:''میں ان ریشمی نازک ہاتھوں سے کام نہیں کرواؤں گی میری بیٹی تو نور ہے نور۔''

''پر امی مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔''

میری بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔اب امی سے مزید اُمید باندھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔وہ پوری طرح اپنی بات پر قائم تھیں۔

باب 2

''پتا نہیں نور تم نے یہ کون سا کام پکڑ لیا ہے۔ سارے پرندے اپنے گھر میں جمع کر لیے ہیں۔ اِن کا خیال رکھنا بہت مشکل ہے میری بچی۔'' حسب معمول بی اماں نے میرے پرندوں پر تنقید کرتے ہوئے مجھ پر کڑوے وار چلائے مگر میں نظر انداز کرتے ہوئے اِن کو دانا ڈالنے میں مشغول رہی۔

پتا نہیں کیوں مجھے پرندے بالکل انسانوں سے ہٹ کر لگتے ہیں۔ یہ ہماری بات سنتے ہیں سمجھتے ہیں۔ ہمارے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں حالانکہ ہمیں ایک دن اِن کے گھونسلے میں گزارنا پڑ جائے تو شاید ہم مر جائیں مگر یہ خوشی خوشی ہمارے ساتھ رہتے ہیں، ہم سے محبت کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اپنی آزادی تک ہمارے نام کر دیتے ہیں۔

میں انہی لامتناہی اور بی اماں کے بقول نفسیاتی مریضوں والی سوچوں میں گم تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ دوپہر کا ٹائم تھا اور اسی وقت دروازے پر دستک کی بجائے فون پر بیل بجی تو میں چونک سی گئی۔

دوسری طرف سے مردانہ مگر نہایت شائستہ آواز میں ایک مرد انگریزی زبان میں گویا ہوا:

"Deveta Kumar here from Dex Factory."

میں دیوتا کمار ڈیکس فیکٹری سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے بھی اپنی بی۔اے تک تعلیم کو بھرپور استعمال کرتے ہوئے انگریزی میں کہہ دیا :

"Yes, Sir"

وہ شخص مزید رُک رُک کر بولنے لگا جیسے کسی پریشانی کا شکار ہو۔ انگریزی زبان

میں بات کرتے ہوئے اس نے کہا:

''آپ کی والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ میں ان کو لے کر قریبی ہسپتال پہنچا ہوں اوراب اُن کی حالت قدرے بہتر ہے۔''

میری تو جیسے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ میں نے جلدی سے فون رکھا اور بی اماں کو زورزور سے آوازیں دینے لگی۔ بی اماں ہڑ بڑاتی ہوئی ہاتھوں میں خالص مدینے کی مٹی سے بنی ہوئی تسبیح لیے گھبرائی ہوئی بولیں کیا ہوا نور میری بچی۔

''بی اماں جلدی چلیے امی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی فیکٹری۔اب وہ قریبی ہسپتال میں ہیں۔''

ہسپتال میں داخل ہوتے ہی سٹاف سے پوچھنے پر ہم دونوں امی کے پاس تھیں۔

امی کی حالت قدرے بہتر تھی مگر مجھ سے نہیں دیکھا جار ہا تھا اور بار بار امی کو اپنی کل والی بات یاد کروا رہی تھی۔''امی آپ کو کہا تھا نا کہ اب میں فیکٹری جاؤں گی مگر آپ نہیں سنتیں۔اب میں آپ کی ایک بات نہیں مانوں گی۔آپ اب آرام کریں گی۔''

میں انھیں باتوں میں مصروف تھی کہ پیچھے سے کسی مرد کی آواز آئی۔ میں نے جب مڑ کر دیکھا تو ہلکے گلابی رنگ کی شرٹ میں ملبوس ایک آدمی نہایت احترام سے میری طرف اپنے دونوں ہاتھوں سے شاپر بڑھا رہا تھا۔

''یہ کیا اور آپ کون؟''

وہ پھر بھی چپ رہا اور حیرت زدہ بھی۔

شاپر کھلنے پر معلوم ہوا اس میں امی کی دوائی ہے۔ میں نے شاپر سے نظریں ہٹائیں اوراپنے جواب کے انتظار میں دوبارہ اُس شخص کی طرف دیکھا۔

وہ انگریزی میں بتانے لگا:''میرا نام دیوتا کمار ہے۔میں نے ہی آپ کو کال کی تھی اور میں ہی آپ کی والدہ کو ہسپتال لے کر آیا ہوں۔''

اُس شخص نے مزید بتایا کہ میں اُسی فیکٹری میں منیجر ہوں جہاں آپ کی والدہ کام کرتی ہیں۔

یہ سننا ہی تھا کہ اُس شخص پر جیسے میری نظریں ہی ٹھہر گئیں۔شکر ہے بی اماں نے آگے بڑھ کر کہا بیٹا بہت شکریہ اور یوں میں نے بھی Thank you کہہ دیا۔

اتنے میں نرس آ گئی اور کہنے لگی: ''اب آپ کی مریضہ کا شوگر لیول نارمل ہے۔ آپ چاہیں تو اِن کو گھر لے جا سکتے ہیں۔''

میں نے نرس کا شکریہ ادا کیا اور اتنے میں دیوتا کمار سر بولے:

''اگر آپ کہتی ہیں تو میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔''

میں نہ کرنے ہی والی تھی کہ بی اماں گویا ہوئیں ''جی جی بیٹا کیوں نہیں ویسے بھی اتنی سردی میں فرخندہ مزید بیمار نہ ہو جائے تم اُتار دو ہمیں بہت مہربانی ہوگی۔''

ہمیں گھر چھوڑ کر دیوتا کمار چلے گئے مگر نہ جانے مجھے کیوں اِن کی اچھائی اور رحم دلی دیکھ کر بار بار ان کا خیال آ رہا تھا۔شاید یہ پہلی دفعہ تھا جب میں نے کسی نامحرم کے بارے میں اتنا سوچا۔اس سے پہلے ابا کے بارے میں سوچتے سوچتے اکثر لمحات گزر جاتے تھے کہ میرے ابا کی شکل کیسی ہوگی کیا بالکل تصویر والی یا اس تصویر سے مختلف جو اماں مجھے دکھاتی ہے۔میرے ابا بات کیسے کرتے ہوں گے؟ وہ کیسے چلتے ہوں گے اور بہت کچھ۔

آج میں بادلوں میں چاند کی تلاش میں نہیں تھی بلکہ اس کیفیت کی تلاش میں تھی جو اُس شخص کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد مجھے بے چین کیے ہوئے تھی اور دُور کہیں عشاء کی اذان ہو رہی تھی اور شام اپنا رنگ گہری رات میں تبدیل کرنے کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ دھند بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

باب 3

''اکرم میں نے تمہیں چائے لانے کے لیے نہیں، فائل لانے کے لیے کہا تھا۔ ایک بات کو غور سے سنا کرو، اُٹھاؤ چائے اور فائل لے کر آؤ جلدی سے۔''

دیوتا کمار نے قدرے سخت لہجے میں اکرم کو حکم دیا۔ اکرم دیوتا کمار کا خصوصی معاون کار تھا۔ فائلز لانا، چائے، کھانا اور چھوٹے موٹے کاموں پر معمور تھا۔

اکرم فائلز رکھتے ہوئے کہنے لگا سر! ایک لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

دیوتا کمار نے پوچھا کہ کیا نام ہے اس کا اور کس سلسلے میں؟ ''سر وہ کہہ رہی تھی کہ یہ سب باتیں اندر آ کر آپ کو خود بتائے گی۔'' او کے بھیجو جلدی پھر مجھے فیکٹری کے راؤنڈ پر نکلنا ہے۔

''جی سر!''

میں نے اجازت مانگی اندر آنے کی تو دیوتا نے اپنا سر اثبات میں ہلا کر اندر آنے کا اشارہ دیا۔ میں تھوڑی سی گھبراہٹ کی کیفیت میں پوچھے بغیر ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

دیوتا نے انگریزی زبان میں مجھ سے کہا کہ اپنا تعارف کرائیں اور میرا تو جیسے کسی نے گلا ہی دبا دیا۔ آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ آواز نکلتی بھی تو کیسے۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کیسا آدمی ہے دو دن پہلے میری ماں کو اتنے اچھے مہربان طریقے سے ہسپتال لے کر گیا مجھ سے بات بھی کی اور پھر بھی مجھے بھول گیا۔

خیر جیسے تیسے میں نے اپنا تعارف ان الفاظ میں دیا: ''میرا نام درخشاں نور ہے۔ میں نے بی۔اے کیا ہوا ہے اور نوکری کی تلاش میں ہوں چونکہ میری والدہ فرخندہ بیگم اسی فیکٹری میں کام کرتی رہی ہیں تو میں چاہتی ہوں کہ مجھے بھی......'' اتنا کہہ کر مجھ سے مزید نہ بولا گیا۔

دیوتا کمار نے میری والدہ کا نام دوبارہ پوچھا تو میں نے '' فرخندہ بیگم'' بتایا۔ پھر چائے کا سپ لے کر گردن فائل پر جھکاتے ہوئے بولے جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں۔

''او اچھا تو فرخندہ بیگم کی بیٹی ہیں آپ۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب کے باراُن کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں اور میرے چہرے کو غور سے دیکھ کر کہنے لگے: ''اُس دن غالباً آپ نے ہی فون اُٹھایا تھا اور ہسپتال میں بھی آپ سے ملاقات ہو چکی ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ عزت رہ گئی صاحب کو خود ہی سب یاد آ گیا۔

میں دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اچانک ہی وہ کہنے لگے کہ '' دیکھیے محترمہ کیا نام بتایا آپ نے؟'' جیسے کہ اُن کو میرا نام لینے میں دشواری ہو رہی ہو کیونکہ دیوتا کمار سری لنکن تھے اور اُن کی مادری زبان سنہالی اور ہماری اُردو زبان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی میں اپنا آدھا نام ہی بتانا مناسب سمجھا تا کہ اُن کو مشکل پیش نہ آئے۔

''جی سر نور۔ آپ مجھے نور ہی کہہ لیں۔'' میں جیسے اُن پر کوئی احسان کر کے اتنی بڑی اجازت دے دی ورنہ بچپن سے لے کر گھر، سکول، کالج ہر جگہ میرا مکمل نام ہی میری شناخت تھا مگر آج میں نے اپنے آدھے نام سے دستبرداری کی تو نا جانے کیوں مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

''جی مس نور'' دیوتا کمار نے انگریزی زبان میں، ''ہم آپ کو آپ کی والدہ کی جگہ کام پر نہیں رکھ سکتے اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں کیونکہ آپ کی تعلیم بی۔اے ہے۔ آپ کسی اور جگہ پر اچھی نوکری بھی کر سکتی ہیں پھر کیوں آپ اپنی والدہ کی جگہ محنت والا کام چاہتی ہیں؟''

میں یہ سُن کر ناامیدی کے انداز میں صرف ''او۔کے سر'' کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی کہہ دیا: ''سر آپ کا ٹائم لیا اس کے لیے شکر گزار رہوں گی۔ اجازت چاہتی ہوں'' اور دل میں جاتے ہوئے خود کو کہنے لگی بھئی درخشاں نور عزتِ نفس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا جو بھی ہو اس آدمی کے سامنے گڑگڑانا نہیں ہرگز۔

اور دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ دیوتا کمار نے آواز دی:

''نور بات سُنیں ذرا۔''

پتا نہیں کیوں آج مجھے اپنے نام پر رشک آنے لگا اور اپنا نام کا آدھا حصہ بھی مکمل لگا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دیوتا کمار اپنی عینک کے اندر سے جھانکتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں بولے: ''بیٹھیے محترمہ!'' اور فائل کو آگے پیچھے کرنے کے بعد بولے۔ ''دیکھیے میں اصل میں نہیں چاہتا کہ آپ کو معمولی کام دیا جائے کیونکہ آپ کی تعلیم بھی زیادہ ہے تو ہمیں ایک سپروائزر کی ضرورت ہے تاکہ کام کرنے والوں پر نظر رکھ سکے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں وہاں آپ کی جگہ بنا سکتا ہوں۔''

میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی۔

پھر دیوتا کمار نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کسی کو اندر آنے کا کہا۔

اکرم نے اجازت طلب کی اور نہایت عاجزی سے کہا: ''سر آپ نے بلایا؟''

''ہاں اکرم یہ مس ہاں نور ہیں'' جیسے اُن کو میرا آدھا نام بھی یاد رکھنے میں مشکل ہوئی ہو۔ ''ان کو فیکٹری کا سپروائز کا عہدہ دیا گیا ہے۔ آپ اِن کو میڈم آسیہ سے ملوا دیں تاکہ وہ اِن کو کام سمجھا دیں۔''

میں نے جاتے ہوئے کہا: ''سر بہت شکریہ آپ کا میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی دل لگا کر کام کروں گی۔ دیوتا کمار نے عملی شخص کی طرح کہا: ''مس نور یہ تو آپ کا

کام ہی بتائے گا۔''

میں نے نوٹ کیا یہ شخص بہت اصول پرست، اور اپنے کام کو لے کر نہایت سنجیدہ ہے۔ اکرم مجھے میڈم آسیہ کے روم میں لے گیا جو اخلاقی لحاظ سے قدرے اچھی خاتون نظر آئی اور مجھے بہت شائستگی سے سارا کام سمجھایا۔ ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ فیکٹری کا ہر فرد ہی دیوتا کمار جیسا ہوگا۔ خیر میں نے پورے چار بجے تک اپنے کام کو سمجھنے اور فیکٹری کے اندر اپنا پہلا دن بہت گرم جوشی سے گزار کر گھر کی راہ لی۔ سارا رستہ مجھے اپنی صبح والی دیوتا کمار سے ہونے والی ملاقات کا احوال پھر سے تازہ ہونے لگا۔

ویسے ایسے شخص کے ساتھ کام کرنا مشکل ہوگا کیونکہ کام میں کوتاہی تو برداشت نہیں کرے گا۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی اس طرح وسوسوں کے ساتھ ہی سارا سفر گزر گیا اور کب گھر آ گیا مجھے پتا ہی نہ چلا۔ گھر آ کر پتا چلا کہ امی کی طبیعت بہتر نہیں تو پھر بی اماں کے ساتھ دوبارہ ہسپتال سے شوگر چیک کروانے کے بعد گھر پہنچی تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ امی کو ان کے کمرے میں دوائی وغیرہ دے کر یاد آیا میں نے تو رات کا کھانا ہی نہیں کھایا۔ بی اماں نے دال چاول بنائے تھے تو پلیٹ میں ڈال کر کمرے میں ہی لے آئی۔ ویسے بی اماں کا ہمیں بہت آرام ہے۔ بچاری کے خاوند جوانی میں فوت ہو گئے۔ رشتے میں میرے بابا کی بہن ہے مگر ہم اِن کو بی اماں ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔

کبھی کبھی غصے میں آ جاتی ہیں مگر دل کی بہت نیک خاتون ہیں۔ سبزی فروش سے لڑ بھڑ کر دام کم کروانا، دودھ والے کی دودھ میں پانی ملانے پر چھترول کرنا اور محلے کی ساری عورتوں کے چھوٹے موٹے کاموں میں اُن کی مدد کرنا بی اماں کے پسندیدہ مشغلے ہیں۔

باب 4

دیوتا کمار حسبِ معمول شام سات بجے فیکٹری سے نکلے اور اس وقت دھند اپنے جوبن پر تھی۔ گاڑی گیراج میں پارک کرتے ہوئے دیوتا نے خان بابا کو آواز لگائی۔ ''خان بابا دروازہ بند کر دیں اور میرے لیے کھانا گرم کریں۔''

خان بابا دیوتا کمار کا وفادار ملازم تھا جب سے وہ پاکستان آیا تھا خان بابا کا شمار اُن چند افراد میں تھا جن پر دیوتا کمار آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتا تھا اور خان بابا بھی دیوتا کمار کے لیے مزے مزے کی سبزیاں تیار کرتا تاکہ اپنے مالک کا دل جیت سکے۔

آج بھی خان بابا نے اچھے اچھے چائنیز کھانے بنا کر ٹیبل سجا کر اپنے مالک کے روم میں گیا جہاں پر دیوتا کمار حسبِ معمول اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لیپ ٹاپ پر ویڈیو کال میں مصروف تھے۔

خان بابا کے بولے بغیر ہی اس کے آنے کا مقصد سمجھ کر دیوتا کمار نے احترام سے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ابھی آتا ہوں۔

دیوتا کمار کے دو بیٹے راون اور کشور جن کے نام تھے ہر روز اپنے والد سے بات کرنے کے عادی تھے۔ جب تک وہ اِن سے بات نہیں کرتا تھا وہ سوتے نہیں تھے۔ شاید والد کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے اور دیوتا کو بھی تو اپنے دونوں بچوں سے بہت پیار تھا اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کھانا کھائے بغیر ہی اُن سے بات کر رہا تھا۔

دیوتا آج اپنی بیوی ٹینا سے بات کرتے ہوئے اُسے پاکستان لانے کی یقین دہانی کرا رہا تھا مگر ٹینا ہر بار کی طرح اس بار بھی اس بات کو افسردگی سے سُن رہی تھی۔

پھر دیوتا نے اُسے چند جادوئی رومانوی الفاظ کہے اور ٹینا زور سے مسکرائی اور

جواب میں ''I Love you too'' کہا۔
''چلے جایئے آپ پھر۔کھانا کھالیں کل بات ہوگی۔''ٹینا نے درخواست کی۔
دیوتا کمار نے ٹھنڈی آہ بھری۔
''یار ایک تو میں جب بھی رومانٹک ہونے لگتا ہوں تم کوئی نہ کوئی کام بتا دیتی ہو۔''
ٹینا شرارتی انداز میں مسکرائی اور''Bye'' کہہ کر بات ختم کی۔
''خان بابا میں نے آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ڈشز نہ بنایا کریں ہمارے ملک میں کئی ایسے لوگ ہیں جو روز رات کو بغیر کھانا کھائے سو جاتے ہیں۔''
دیوتا نے کھانے کی ٹیبل پر ضرورت سے زیادہ کھانے دیکھ کر خان بابا کو سمجھایا۔
اور خان بابا بڑی توجہ سے دیوتا کی ساری باتیں سُن کر ہاں میں سر ہلا رہا تھا۔''آپ نے کھانا کھایا؟'' پھر دیوتا نے خان بابا کی فکر کرتے ہوئے پوچھا۔
''جی صاحب جی تب ہی کھالیا تھا اصل میں میرا معمول ہے مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھالیتا ہوں۔'' خان بابا نے اطمینان سے کہا۔
''خان بابا آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ مجھے صاحب مت کہا کریں۔بیٹا یا میرے نام سے بلایا کریں۔''
خان بابا نے دیوتا کی اس قدر محبت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اصل میں خان بابا کو اپنے بیٹوں کا رویہ یاد آ گیا جنہوں نے شادی کے بعد خان بابا کو زمین کے کاغذات نہ دینے پر گھر سے ہی نکال دیا تھا۔
خان بابا آج پھر مسلمانیت اور اس شخص دیوتا کمار کے مذہب بدھ مت کا موازنہ کرنے میں مصروف تھا اور سوچ رہا تھا۔
کہ ہمارا مذہب جو ہمیں سکھاتا ہے عمل تو اصل میں یہ لوگ کر رہے ہیں۔ہم تو

مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم اسلام میں اس بات پر عمل کرتے ہیں جس پر عمل کر کے ہمیں فائدہ حاصل ہو۔ ہمیں یہ تو پتہ ہے کہ سؤر کا گوشت کھانا حرام ہے مگر ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں ہم اسلام کے اور بہت سارے احکام کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، سچ نہیں بولتے، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے، غریب رشتہ داروں کا خیال نہیں رکھتے، ہمسائیوں کے گھر آج کچھ کھانے کے لیے پکا ہے یا وہ بغیر کھانا کھائے سو گئے، ہم یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

اصل میں تو مذہب ہمیں نہیں ہم مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے چلا رہے ہیں۔

خان بابا انہی سوچوں میں گم تھے کہ دیوتا نے کہا: ''خان بابا بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے اچھی سی ایک کپ کافی بنا دیں۔''

''جی صاحب جی!'' خان بابا نے جلدی سے اپنی زبان کی روانی کی غلطی پر قابو پاتے ہوئے کہا: ''جی بیٹا ابھی لایا۔''

دیوتا کمار خان بابا کی معصومیت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ کا یہ مرد دیکھنے میں نہایت ہی سادہ رہن سہن کا مالک تھا، اچھی خاصی تنخواہ کے باوجود فضول خرچی سے کوسوں دُور تھا۔ فیکٹری سے گھر اور گھر آ کر فیملی سے بات اور کھانا کھانے کے بعد تھوڑی سی واک کے بعد اس کا پسندیدہ مشغلہ اچھی سی کافی اور کسی بہترین لکھاری کی کتاب پڑھنا ہوتا۔ آج بھی وہ "Death of a Hero" پڑھنے میں مصروف تھا۔ Richard Aldingto کی یہ بک اس کی شلف میں کافی سالوں سے پڑی تھی مگر اسے کبھی بھی اسے پڑھنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ کئی دفعہ اس نے کوشش کی کہ اسے پڑھ ڈالے مگر ہر دفعہ کوئی اور نئی کتاب اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔

اس کتاب کا دلچسپ موضوع یہ تھا کہ یہ ایک بہادر نوجوان آرٹسٹ جارج ونٹر لورن کی کہانی ہے جو کہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ یہ کتاب تین

حصوں پر مشتمل ہے اور دیوتا ابھی Death of Hero کے پارٹ ون کو پڑھنے میں مشغول تھا اور جارج کی خاندانی تاریخ کو پڑھتے ہوئے کافی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جارج کے والد نے انگلینڈ کے دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ایک متوسط طبقے کے آدمی نے ایک غریب عورت سے شادی کی جو کہ کسی امیر شخص سے شادی کے خواب سجائے بیٹھی تھی اور شدت سے خواہش رکھتی تھی کہ اس کی شادی کسی پیسے والے خاندان میں ہو اور اس کے گھر والے اس سے جھوٹ بول کر کہ ہم تمہاری شادی امیر خاندان میں کروا رہے ہیں۔ دوسری طرف جارج کی ماں اسی جھوٹ پر یقین رکھتی ہے کہ اس کی شادی کسی امیر گھرانے میں ہو رہی ہے۔ اس کو شادی کے بعد اس بات کا علم ہونے کے بعد اس کی اپنے شوہر سے بے وفائی کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

دیوتا کتاب پڑھتے پڑھتے کتاب کو اپنے چہرے پر رکھے نیند کے سمندر میں غوطے لینے لگا اور کہانی کا اگلا حصہ کل پھر اسی وقت پر چھوڑ دیا گیا۔

''دیوتا بیٹا ناشتہ لگ گیا'' خان بابا نے ٹھیک سات بجے دیوتا کے روم میں دستک دی۔ دیوتا جو پہلے ہی آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال سیٹ کر رہا تھا گھڑی باندھتے ہوئے کہا جی خان بابا بس میں آیا دو منٹ میں۔

گھر سے فیکٹری کا راستہ صرف 30 منٹ کا تھا اور دیوتا کبھی بھی 30 منٹ میں آفس نہیں پہنچ سکا۔ سگنل، سکول کے بچوں کا رش معمول کی ٹریفک میں شامل تھا۔

خیر فیکٹری میں گاڑی پارک کرتے ہوئے دیوتا نے ایک بڑی آنکھوں والی نقاب پوش لڑکی کو فیکٹری میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دل میں کہا ''یہ تو وہی ہے نا کیا نام تھا۔ ہاں نار نور نور ہاں نور تھا اس کا نام۔'' دیوتا کو پھر سے نام یاد رکھنے میں مشکل ہوئی۔

نا جانے نہ چاہتے ہوئے بھی درخشاں نور کی بھوری آنکھیں کسی کی توجہ حاصل کر

لیتی تھیں اور وہ اس بات سے بے خبر تھی۔ جس انسان نے اس کی آنکھوں سے راتوں کی نیند اُڑائی ہے وہی اس کی آنکھوں کے ساگر میں ڈوب رہا تھا مگر وہ اس بات کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ اُس کا دل بار ہا اُس کو ان آنکھوں کی طرف توجہ دلا رہا تھا ہر بار اس کے اندر کا خوددار غیرت مند مرد اس بات کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ اس کی وجاہت اس کا اعلیٰ کردار تھا جو اسے دوسرے مردوں سے ممتاز کرتا تھا اور یہی وجہ تھی جس کے باعث درخشاں نور اس کے کردار کی خوشبو پا کر اس کو اپنے دل میں مقام دے رہی تھی۔

دیوتا نے آج اپنے آفس میں آتے ہی آج کی فائل اٹھائی اور آج کی ساری دن کی میٹنگ روٹس چیک کرنے لگا مگر اس کا ذہن لاشعوری طور پر اسے بار بار ان آنکھوں کی یاد دلا رہا تھا پھر اس نے ہار مانتے ہوئے اپنا سر کرسی پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں اور پھر اس کا دل مصروف تخیل کی پرواز بھرنے لگا۔

محمور آنکھیں
دل نشین آنکھیں
صبح کی پہلی کرن وہ آنکھیں
حیا کی تسبیح پڑھتی آنکھیں
لفظوں کو دیتی ہیں وہ زبان آنکھیں
نیند سے بوجھل
خوشی سے عاری
پھر بھی چمکتی اور
ہنستی ہیں آنکھیں

دیوتا اپنی انہیں سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، سامنے درخشاں نور تھی۔

بعض دفعہ کسی کو اتنی شدت سے یاد کرتے ہیں وہ تخیل سے نکل کر بالکل ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے ہم اسے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں چنانچہ یہی دیوتا کے ساتھ بھی ہوا۔

''آجائیں نور!'' حیرت کی ملی جلی کیفیت میں دیوتا نے کہا

درخشاں نور کو بیٹھنے کا کہہ کر دیوتا یہ بھول گیا کہ وہ کس سوچ میں مبتلا تھا فوراً سے اپنی پوزیشن اور مرتبہ کا خیال کرتے ہوئے فائل پر سر جھکا کر کہا:

''جی کہیے کوئی کام تھا آپ کو۔'' دیوتا ایسا ہی تھا سرد اور لہجہ کا سخت اور اپنے احساسات کو اپنے دل کی تہہ میں چھپانے والا۔

اب تو وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنا تو دور بات بھی فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے لاپرواہی سے کر رہا تھا۔ درخشاں نور کو اپنی کمتری کا خیال ستائے جا رہا تھا اور دل ہی دل میں وہ کہیں بہت دور جنگلوں کے گہرے سایوں میں بھٹک رہی تھی۔

ایک مرد اپنا فلیگ اگر سو دن چھپا سکتا ہے تو یہ کام عورت صدیوں میں بڑے آرام سے سرانجام دے سکتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔

درخشاں نور نے پراعتماد لہجے میں بات شروع کی۔'' سر اصل میں یہاں آپ سے بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں اور اُمید کرتی ہوں کہ آپ اس میں میری مدد ضرور کریں گے۔''

''جی محترمہ! آپ کچھ بتائیں گی تو بات آگے بڑھے گی۔''

دیوتا Frustration کا شکار ہونے لگا۔

''جی سر اصل میں نائمہ اور عائقہ دونوں بہنیں جو ہماری عورتوں کی دن کی شفٹ میں کام کرتی ہیں بات اُن کے بارے میں ہے۔ سر وہ دونوں بہت پریشان ہیں۔ عاصم اور عابد اور ان کے ساتھ تین اور مرد جن کے نام اُن کو معلوم نہیں وہ روز ان کو فیکٹری کے گیٹ

کے باہر تنگ کرتے ہیں۔ سر آپ کو تو پتہ ہے وہ دونوں کم عمر ہیں اور اُن کے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں وہ مجھے اپنی بڑی بہن سمجھتے ہوئے آج یہ ساری بات بتا رہی تھیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کچھ کریں تا کہ ہماری فیکٹری کے عملے کے افراد کو نصیحت ہو اور کوئی بھی عورت پر اُنگلی نہ اُٹھا سکے۔"

نور تو یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔ جبکہ دیوتا کمار کو نہایت غصہ آرہا تھا جس نے بامشکل اپنے غصے کو درخشاں نور کی وجہ سے کنٹرول کیے ہوئے کہا:

"مس آپ جایئے اپنا کام توجہ سے کریں۔ آپ کو اس کا رزلٹ آج کے دن میں ہی ملے گا اور عملے کے کسی فرد سے اس بات کا ذکر مت کیجیئے گا۔ یہ بات ہمارے درمیان ہی رہنی چاہیے۔"

درخشاں نور جاتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ شاید یہ آدمی بھی عام مردوں جیسا ہے بات کو دبانا چاہتا ہے۔ اس کو بھی اپنی فیکٹری کی فکر ہے اور فیکٹری کا نام خراب نہ ہو اس لیے اس نے مجھے راز میں رکھنے کا کہا۔ درخشاں نور کی شروع سے ہی عادت تھی نتائج پہلے ہی سے اپنے دماغ میں بُننے کی۔ آج بھی وہ یہی کر رہی تھی۔ اسے اپنی ذات کے نظر انداز ہونے کا دُکھ الگ کھائے جا رہا تھا۔ خیر اس نے یہ ساری باتیں ایک طرف رکھتے ہوئے تمام لیبر خواتین کے کام کو چیک کرنا شروع کیا اور خود کو کام میں مصروف کر لیا۔ بعض دفعہ ہم سب ہی اپنے ذہنی خلفشار سے بچنے کے لیے خود کو اتنا مصروف کر لیتے ہیں کہ ہمیں کچھ بھی محسوس نہ ہو۔ یہی کام درخشاں نور کر رہی تھی۔ مصروف بھی کبھی کبھی عبادت اور دوا بن جاتی ہے۔

"آنٹی رقیہ یہ دیکھیں جیکٹ کا بازو سیدھا نہیں۔ سلائی اچھی طرح سے لگائیں مجھے لگتا ہے آپ کی آئی سائٹ پہلے سے بہت کمزور ہوگئی ہے اس دن بھی آپ سے کہا تھا عینک پہن کر آیا کریں مگر آپ ہر روز گھر بھول آتی ہیں۔" درخشاں نور نے پیار اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

''ہاں بیٹا! آج پھر گھر رہ گئی۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔'' رقیہ نے اپنی غلطی تسلیم کی تو نور مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

مسکراتے ہوئے اس کے گلابی گال لال گلاب دکھائی دیتے تھے جو کسی بھی چہرے پر مسکراہٹ لا سکتے تھے۔

یہ ایک بجے کی بریک کا وقت تھا جب درخشاں نور کو اکرم آتا دکھائی دیا۔''میڈم آپ کو دیوتا سر اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔'' درخشاں نور نے سینڈوچ کا ٹکڑا پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے کہا:''جی میں ابھی آتی ہوں۔''

''باجی آپ نے ہمارے بارے میں جو صبح بات کی مجھے لگتا ہے سر نے آپ کو اسی بارے میں بلایا ہے۔'' نائمہ نے کہا ہوسکتا ہے۔ درخشاں نور نے اپنا حجاب ٹھیک کرتے ہوئے کہا'تم لوگ فکر نہ کرو میں ہوں نا'' درخشاں نے نائمہ اور عائقہ کو شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

''جی بیٹھیے نور!''

''جی سر! آپ نے بلوایا تھا۔'' درخشاں کو اپنی ذات کے نظر انداز ہونے سے ڈرتے ہوئے ٹو دی پوائنٹ بات کرنا مناسب لگا۔

''جی نور!''

''میں نے عاصم اور عابد کے ساتھ تین مردوں کا پتہ لگا لیا ہے اور ابھی ابھی میں نے ان کو نوکری سے نکال دیا ہے۔ ہماری فیکٹری میں کسی بھی ایسے مرد کی جگہ نہیں جو عورت کی عزت کرنا نہیں جانتے۔ ہمارا معاشرہ عورت کی عزت کو مقدم تب تک نہیں سمجھے گا جب تک ہم اس کے لیے سخت قانون نہیں بنائیں گے۔''

درخشاں نور کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ عورت کے لیے اس قدر احترام دیکھ کر درخشاں نور کو جیسے عورت ہونے پر ناز ہونے لگا اور کہیں اس کا دل قرآن کی اس آیت کا ورد

کر رہا تھا: ''پھر وہ تمہاری من پسند چیز تم تک لائے گا مقررہ وقت پر اور تم حیران ہو جاؤ گے۔'' (القرآن)

''تھینک یو سو مچ'' درخشاں نور نے دیوتا کمار کو اپنے خیالات سے باہر آتے ہوئے شکریہ کے الفاظ کہے جو کہ اسے بہت کم لگ رہے تھے۔

''اِٹس آل او کے۔'' ''یہ میرا فرض تھا'' دیوتا نے بات کو ختم کیا۔ ''آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اب دیوتا جیسے موضوع تبدیل کرنا چاہ رہا تھا۔

''جی سر! پہلے سے بہت بہتر ہیں امی۔'' درخشاں نور نے اپنی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

دیوتا کو بھی اس کی یہی حیا اور پاکیزگی متاثر کر رہی تھی۔ یہ سچ ہے مرد کو عورت کی خوبصورتی بھاتی ہے مگر اس کی حیاء اور پاکیزگی کسی مرد کو اس وقت متاثر کرتی ہے جب اگلا مرد بھی انہی صفات اور خوبیوں سے لبریز ہو ورنہ عورت ہر مرد کے لیے سوائے گرم گوشت کے ڈھیر کے کچھ بھی نہیں ہوتی۔

''چلیں مجھے ایک ٹور پر نکلنا ہے آپ بھی اپنا کام دیکھیں جا کر'' یہ کہہ کر دیوتا صحرائی بگولے کی مانند اپنی فائل اُٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

درخشاں نور کافی دیر وہیں بیٹھی ہوئی دیوتا کے ساتھ چند منٹ میں ہونے والی گفتگو کے ہر ہر لفظ کو دس دس بار دھرا رہی تھی اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ براجمان تھی اور اس کی آنکھیں اور دل محبت کی پہلی بارش کو محسوس کر رہے تھے۔

دیوتا جاتے ہوئے درخشاں نور کو پھر سے ایک آس دے گیا جو درخشاں نور کے لیے بہت کافی تھا۔

رات کو بستر پر لیٹے ہوئے درخشاں نور آنکھیں موندے سوچ رہی تھی ''کس قدر اعلیٰ اخلاق، خوددار اور اصول پسند انسان ہے یہ شخص۔ جب بات کرتا ہے تو شرافت کے جام

پیتا ہے، جب چلتا ہے تو زمین بھی ناز کرنے لگتی ہے۔ پر جب مسکرائے تو وجاہت ٹپکتی ہے اس شخص کی دو چار ملاقاتوں نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے؟'' درخشاں نور تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز لیٹی ہوئی اپنے کھلے ہوئے سنہری بالوں کو پونی سے آزاد کیا اور قلم اور کاغذ کو تھام لیا۔

وہ لڑکی
جس کے چہرے پر سدا اُداسی رہتی تھی
جس کے ہونٹ کبھی اخلاقاً بھی ہنستے تو
یوں لگتا تھا
اِک لمحہ بھی اور ہنسے تو
اُس کی آنکھیں رو دیں گی!

جو، روزانہ،
اپنے وقت پر کالج آتی
سب سے الگ اپنی دنیا میں گم رہتی
اپنے کھوئے ہوؤں کی جستجو میں رہتی
وہ خاموش، اُداس سی لڑکی
میرا کہنا مان کے محبت کے راستے پر چل دی
میں نے دیکھا
میری کھڑکی سے چاند کے ہمراہ
وہ پانی میں بیٹھی ہے
دریا کے سنہری پانی کی لہروں
سے کھیل رہی ہے
جانے کون سی بات ہوئی

سب کے ساتھ وہ ہنس دی ہے
اوراس لمحے
اُس کے ہونٹوں کے ہمراہ
اُس کی آنکھیں بھی ہنستی ہیں!

دوسری طرف دیوتا بھی اپنی شام کی کافی اور Richard Aldingto کی بک Death of a Hero تھامے ہوئے اپنے روم میں لگے ہوئے صوفے پر ہی ٹیک لگائے ہوئے لیٹ گیا۔

اس نے اپنی کہانی وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ جارج کی زندگی کو آگے بڑھاتے ہوئے آج وہ کہانی کے ہیرو جارج کی پرورش اوراس کے جوانی کے سفر کو پڑھنے میں مصروف تھا۔ جارج کا بچپن اور ابتدائی تربیت انگریزی معاشرے کے ایک مناسب اورمحبّ وطن رکن کے طور پر ہوئی ہے۔ اسے اپنے والد کا انشورنس کاروبار سیکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اپنے والدین کے ساتھ اختلاف کے بعد جارج ایک فنکار بننے کے لیے اپنی زندگی کو اپنے مطابق گزارنے کے لیے لندن منتقل ہوگیا۔ یوں کتاب کا اول حصہ اختتام کو پہنچا۔

دیوتا نے اپنی کافی کے مگ کو دیکھا تو ناول پڑھتے پڑھتے وہ اسے پینا ہی بھول گیا۔ مطالعہ میں اس قدر محو ہوا کہ اسے کافی کا خیال ہی نہ رہا۔ اس نے کتاب کو اُٹھا کر شیلف میں لگایا اور کتاب کا دوسرا حصہ تلاش کرنے لگا کہ اچانک فون پر بیل بجی۔ دیوتا نے دیکھا تو 'wife' کے نام سے موبائل فون کی سکرین جگمگا رہی تھی اور سکرین پر بیٹے ''راون'' کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ ایک خوشگوار سے احساس نے دیوتا کو گھیر لیا۔ آگے بڑھ کر فون اُٹھایا۔

تو دوسری طرف ننھی سی آواز اُبھری۔

''ہیلو پاپا کیسے ہیں آپ؟'' دیوتا کا بڑا بیٹا راون دیوتا سے گویا ہوا۔

جی پاپا میں بھی ٹھیک ہوں۔ پھر راون کا سارا دن کا احوال، سکول، گھر کی شرارتیں اور ماں کی ڈانٹ کی شکایتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ آج بھی یہی ہو رہا تھا اور دیوتا سارے دن کی تھکن کو بھلا کر بہت انہماک کے ساتھ راون کی باتیں سُن رہا تھا اور پھر راون تھک کر اپنی ماں کو فون دے کر سو گیا۔

'' کیسے ہیں جناب کے احوال؟ ٹینا نے شرارتی انداز سے دیوتا کو پوچھا اور ساتھ ہی شکوہ بھی کر ڈالا'' کیا آپ کو سارا دن میری یاد نہیں آتی۔ سارا دن کام میں ہی مصروف کبھی ہمیں بھی یاد کر لیا کریں۔'' ٹینا نے ایک ہی سانس میں دل کا سارا غبار نکال دیا۔

''ارے رُکو میری جان کیا ہو گیا اتنا غصہ'' دیوتا نے ایک بڑا سا قہقہہ لگایا۔

دوسری طرف ٹینا بھی مسکرا دی اور اپنی پہلے کی گئی گفتگو پر غور فکر کرنے لگی۔'' ہاں میں واقعی ہی زیادہ بول گئی۔''

ٹینا کی شروع سے عادت تھی اپنی غلطی فوراً تسلیم کر لیتی تھی اور یہی بات دیوتا کو بھاتی تھیں۔ ٹینا بہت کمپرومائز رتھی۔ ہر بات کو مثبت انداز سے سوچنا اور منفی پہلو میں بھی مثبت پہلو تلاش کر لینا۔ عورت کے اندر ایسی خوبیاں ہونا ہی اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

شکل صورت کے لحاظ سے ٹینا عام سی شکل کی لڑکی تھی مگر آٹھ سال سے کالج میں پرنسپل کی نوکری نے اس کے اندر ایسی بے شمار خوبیاں پیدا کر دی تھیں جس کی وجہ سے وہ پر اعتماد اور پُر کشش دکھائی دیتی تھی اور اس میں اس سوچ کا زاویہ تھا۔

''آپ مجھے باتوں میں مت لگائیں، مجھے بتائیں آپ مجھے کب پاکستان بلا رہے ہیں۔ راون اور کشور بھی آپ کے بغیر اُداس ہو جاتے ہیں۔ آج بھی راون کو میں نے ڈانٹ دیا۔ آپ کو کال کرنے کی ضد کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ پاپا اس وقت آفس میں

ہوتے ہیں، ڈسٹرب ہوں گے۔اب تو آپ کو گئے ہوئے 6 سال ہو گئے ہیں۔کیا آپ کا دل نہیں کرتا ہم سب ساتھ رہیں۔'' ٹینا یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔

دیوتا نے اپنی لمبی آہ اندر کھینچتے ہوئے کہا:

''کیا میرا ابھی دل نہیں کرتا کہ تم لوگ میرے پاس آؤ۔میں تو کبھی کبھی خود کو اتنا تنہا محسوس کرتا ہوں تمہارے پاس تو بچے بھی ہیں ماں پاپا بچے ہیں مگر میں تو یہاں پردیس میں اکیلا ہوں۔

میں کل کمپنی آنر سے کال پر بات کروں گا تمہیں تو پتہ ہے وہ خود لندن ہوتے ہیں۔ساری فیکٹری کا بوجھ میرے سر پر ہے۔مجھے اُمید ہے کہ وہ ضرور کچھ کریں گے۔''

دیوتا نے ٹینا کو تسلی کی نئی اُمید دی جس پر ٹینا نے اطمینان کا سانس لیا اور خوش ہوگئی۔

باب 5

اگلے دن دیوتا نے آتے ہی فیکٹری کے مالک کو کال کی مگر بدقسمتی سے دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں ہوسکی اور دیوتا پھر سے سارے دن کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ آج اس کا روٹ عورتوں کی طرف تھا۔ دیوتا نے نور درخشاں کی نگرانی میں ہونے والے کام پر خوشی کا اظہار کیا جس پر نور درخشاں بھی پر مسرت دکھائی دے رہی تھی۔

''مس نور درخشاں اگر آپ'' اسی طرح محنت سے کام کرتی رہیں تو بہت جلد آپ ترقی کی منازل طے کریں گی۔

نور درخشاں دیوتا کے منہ سے اپنی تعریف سُن کر دور کہیں بادلوں میں اُڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

دیوتا کمار یہ کہتے ہوئے ہال روم سے نکل رہا تھا کہ نور درخشاں جلدی سے اپنے بیگ کی طرف مڑی اور ایک تھیلا اُٹھا کر دیوتا کمار کو آواز دی۔

''سر، سر! دیوتا مڑا تو نور درخشاں کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھیلا دیکھ کر سوالیہ نظروں سے نور درخشاں کو دیکھا۔ اتنے میں نور درخشاں خود بول پڑی ''سر یہ آپ کے لیے ہے۔'' دیوتا نے پوچھا یہ کیا ہے؟

''سر امی نے آپ کے لیے خصوصی آلو قیمہ بنا کر بھیجا ہے۔''

''میرے لیے؟'' دیوتا تھوڑا مسکرایا اور حیرت سے کہا۔

دیوتا کے روم میں آنے سے پہلے ہی نور درخشاں نے آلو قیمہ کے ڈبے سے ڈھکن اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جی سر! امی نے بہت پیار سے بنائے ہیں کہ سر کو میرا سلام کہنا اور ساتھ یہ

دینا۔''

''پرنورافشاں!''

دیوتا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

'میں تو vegetarian ہوں'

''او نو!'' نوردرخشاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور جیسے اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔ ڈبے کا ڈھکن بند کرتے ہوئے شرمندہ ہوئی۔

دیوتا نور کا شرمندہ ہونا سمجھ گیا۔

وہ اس کی معصوم سی خواہش کو رد نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے کہا چلیں ایک کام کرتے ہیں آلو میں کھالیتا ہوں اور قیمہ آپ کھالیں۔

نور کی خوشی کی انتہا نہ رہی کس قدر پیارا انسان ہے یہ!

یوں نور نے روٹی نکال کر آلو قیمہ میں سے بڑی مہارت سے آلو الگ کیے اور دیوتا کو پیش کیے۔

''یہ کیا نور آپ نہیں کھا رہیں؟''

''سر نہیں آپ کھائیں۔''

''نہیں ایسے نہیں چلے گا آپ بھی کھائیں۔ ورنہ میں اکیلا کھاتا اچھا لگوں گا۔ آپ سامنے بیٹھی مجھے دیکھیں۔'' دیوتا نے ضد کی۔

نوردرخشاں نے دل میں سوچا۔

''ہاں یہی تو میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے سامنے ہوں۔ میں آپ کو دیکھوں، آپ کی شخصیت کا مطالعہ کروں، آپ کی باتیں سُنوں، آپ کے اندر کی خوبیوں پر دل کھول کر تعریف کروں اور سب سے بڑھ کر آپ کی موجودگی کو محسوس کر سکوں۔''

''نور، نور، کہاں کھو گئیں آپ۔''

دیوتا نے درخشاں نور کے تخیل کو توڑتے ہوئے کہا۔

جی جی سر!

اور یوں یہ وہ پہلا دیوتا کے ساتھ کھانا تھا جسے درخشاں نور نے خوب انجوائے کیا۔

دیوتا بھی کھانے کا نوالا لیتے ہوئے۔

درخشاں نور کے مغملی ہاتھ پر نظر ڈالتا مگر پھر جھٹک دیتا۔

مگر نور کی موجودگی کا احساس کسی بھی کمبخت کا دل اپنی طرف موم کر سکتا تھا۔

اس کی بڑی بھوری آنکھیں جن پر گہری سیاہ پلکیں جب وہ اٹھاتی اور گراتی تو دیوتا کی توجہ کا مرکز صرف اس کی آنکھیں بن جاتی۔ کھانا ختم ہوا تو درخشاں نور نے کہا۔

''سر آپ کو کبھی محبت ہوئی ہے؟''

درخشاں نور کے ایک دم سے ایسا سوال کرنے سے دیوتا کے جسم میں ایک خوشگوار لہر دوڑ گئی جسے اس نے بامشکل نور درخشاں سے چھپایا۔

''نا نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں۔''

دیوتا نے الٹا ہی درخشاں نور کو سوال کر کے پریشان کر دیا۔

''ایسے ہی سر دل میں آیا تو پوچھ لیا۔ چلیں اب میں چلتی ہوں'' نور درخشاں نے جیسے تحقیر محسوس کی اس کا یہاں مزید رکنے سے دم گھٹ رہا تھا۔

درخشاں نور کھڑی ہوئی تو ایک دم سے چکر آنے سے کرسی پر دوبارہ بیٹھ کر اپنا سر پکڑ لیا۔

دیوتا جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھا ''کیا ہوا نور آپ ٹھیک ہیں؟'' دیوتا نے نور کو ہاتھ لگائے بغیر نور کے قریب آتے ہوئے پوچھا یہ لیں پانی پیئں۔

دیوتا نے نور کو میز پر پڑے ہوئے جگ سے پانی نکال کر دیا۔

''جی سر میں ٹھیک ہوں۔''

درخشاں نور نے پانی کا ایک گھونٹ لے کر گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے آپ کام بہت زیادہ کرتی ہیں اور اپنا خیال بالکل بھی نہیں رکھتیں آپ کو آرام کرنا چاہیے چلیں اٹھیں میں آپ کو گھر چھوڑ دوں ویسے بھی فیکٹری ٹائم بھی آف ہونے والا ہے۔''

''نہیں سر میں چلی میں جاؤں گی'' نور نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

مگر اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی جو کہ دیوتا کو واضح طور پر بتا رہی تھی کہ یہ بالکل ٹھیک نہیں۔وہ پہلے ہی نور درخشاں کے پوچھے گئے سوال پر اس کے جذبات کو مجروح کرنے پر شرمسار تھا اب مزید نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''چلیں اٹھیں۔'' دیوتا نے ضدی انداز میں گاڑی کی چابیاں اور موبائل فون اُٹھاتے ہوئے نور درخشاں کو جیسے حکم سنایا۔

نور نے بھی بغیر چوں چرا کیے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور یوں نور سارے رستے کار کی کھڑکی سے سر لگا کر گہری سوچوں میں بھٹک رہی تھی۔

گاڑی چلاتے ہوئے دیوتا مسلسل درخشاں نور کی حالت کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا تھا۔مگر چاہتے ہوئے بھی وہ اس کو کوئی آس یا اُمید نہیں دے پا رہا تھا پھر آخر کار دیوتا بول پڑا:''نور آپ ٹھیک تو ہیں؟''

نور نے اپنی گہری سوچوں کو جھٹکتے ہوئے دیوتا کی طرف دیکھ کر''ہاں'' میں سر ہلا دیا۔

ہم زبان سے جو بات کہہ نہ سکے
وہ بھی آنکھوں سے کہی تم نے

کبھی کبھی ہم اتنے خاموش ہو جاتے ہیں کہ ہماری زبان سے ایک لفظ ادا نہیں ہو

پاتا جبکہ ہمارے اندر لفظوں کی جنگ چھڑی ہوتی ہے۔ وہ الفاظ بظاہر تو دوسروں کو سنائی نہیں دیتے مگر ان کے شور سے ہماری اپنی سماعتیں بہری ہو رہی ہوتی ہیں۔

نور کو گھر کے باہر ہی اُتار کر دیوتا گاڑی میں وہیں رکا رہا جب تک درخشاں نور آہستہ سے لڑکھڑاتے پیروں کے ساتھ گھر کے اندر داخل نہ ہوئی۔

سارے رستے دیوتا نور درخشاں سے ہونے والے سوال اور اس پر اپنی سرد مہری پر غور فکر کرتا رہا۔ درخشاں نور کے یوں ایک دم سے بیمار ہونے پر وہ خود کو الزام دے رہا تھا کہ شاید اُس کا نازک دل میرے جواب پر ٹوٹ گیا دیوتا اچھی طرح سے جان چکا تھا کہ نور درخشاں اُس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے مگر اس کو اپنے وقار، مرتبے، مذہب، رنگ نسل سے بڑھ کر اپنی فیملی تھی اور وہ ان کے ساتھ دغا نہیں کر سکتا تھا۔

دیوتا کے دل اور دماغ میں ایک نہ ختم ہونے والی جنگ چھڑ چکی تھی اس کا دل درخشاں نور کے سچے جذبے کے سامنے ہار رہا تھا مگر اس کا دماغ اس کے دل کے کسی کونے میں درخشاں نور براجمان ہو چکی تھی وہ اس کے اچھوتے خواب کا پیراہن بن چکا تھا اور درخشاں نور کی آنکھوں کی معصومیت بار بار اُسے ستائے چلی جا رہی تھی۔

درخشاں نور تو آتے ہی کمرے میں چلی گئی بی اماں نے دیکھا تو تشویش ہوئی۔

''ارے میری چندا!''

''کیا ہوا؟ آج نہ سلام نہ دعا نہ فرخندہ کی طبیعت کا پوچھا اور آتے ہی خود کو کمرے میں بند کر لیا'' بی اماں نے نور درخشاں کو رضائی اُوڑھے بستر پر لیٹے دیکھا تو ساری باتیں کہہ ڈالیں۔

''کچھ بول کیوں نہیں رہی درخشاں نور'' بی اماں نے آگے بڑھ کر درخشاں نور کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو حیران رہ گئی درخشاں نور بخار میں تپ رہی تھی۔

ہائے میری چندا اتنا تیز بخار تو مجھے بتایا کیوں نہیں چل اُٹھ میں تجھے ڈاکٹر کے

پاس لے جاؤں۔

ارے او فرخندہ ادھر آؤ نور درخشاں کو دیکھو اسے بہت تیز بخار ہو گیا فرخندہ نور کی ماں جو مغرب کی نماز کے بعد دُعا میں مشغول تھی بی اماں کی آواز پر چونکی جلدی سے دُعا کو ختم کر کے درخشاں نور کے کمرے میں پہنچی۔

''ہاں اماں اسے تو بہت سخت بخار ہے آپ ایسا کریں گلی کی نکڑ پر ڈاکٹر امجد ہیں اُن کو لے آئیں مجھے نہیں لگتا کہ درخشاں نور اس حالت میں ہے کہ چل کر جا سکے۔''

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو فرخندہ'' بی اماں نے بڑی چادر کو سر پر درست کرتے ہوئے کہا اور پھر ڈاکٹر کو لینے چلی گئیں۔

ڈاکٹر سے چیک اپ کے بعد فرخندہ نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ درخشاں نور کو کیا ہوا ہے تو تب ڈاکٹر امجد نے کہاں ''باجی مجھے لگتا ہے ان کو ذہنی دباؤ ہے۔ بخار انشاءاللہ صبح تک ختم ہو جائے گا آپ اسے ذہنی دباؤ سے باہر نکالیں۔''

فرخندہ ڈاکٹر امجد کو گیٹ سے باہر چھوڑتے ہوئے واپس مڑی اور درخشاں نور کے بارے میں سوچنے لگی ''شاید میں نے سارا بوجھ اس ننھی جان پر ڈال دیا زیادہ کام کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو گئی۔'' فرخندہ کو وسوسوں نے گھیر لیا۔

درخشاں نور کو دوائی کھلا کر فرخندہ ساری رات درخشاں نور پر آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہی اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور فجر سے پہلے درخشاں نور کی آنکھ کھلی تو موبائل فون اُٹھا کر دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ یہ نماز تہجد کا وقت تھا اس نے فون کو دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اپنا دوپٹہ ٹٹولنے لگی۔ اپنے سر پر اوڑھنے سے پہلے اس نے اپنے بالوں کو جو کہ سانپ کی کنڈلیوں کی طرح اِدھر اُدھر بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے اور کمرے کی نیلی روشنی ان کے سُنہری پن کو مزید چار چاند لگا رہی تھی۔ اس نے ان کو ایک کلپ کی مدد سے بے رحمی سے قید کر دیا اور پھر ہمت کر کے اپنے پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے

اور سلیپر پاؤں میں ڈالتے ہوئے آہستہ سے وضو کرنے چلی گئی۔

وضو کرنے کے بعد وہ جائے نماز پر بیٹھ گئی۔

جائے نماز پر بیٹھ کر درخشاں نور نے محسوس کیا تو اس کی آنکھوں سے صرف آنسو رواں تھے اور ہونٹوں پر وہی آیت تھی۔ جسے وہ ہر مصیبت اور پریشانی میں جب بھی پڑھتی تھی تو اسے حوصلہ ملتا تھا۔

ولَا تھنُوا ولَا تحزَنوا

ترجمہ: ہمت مت ہار پریشان مت ہو۔

اس کی ہچکی بندھ چکی تھی اس کی گہری بھوری آنکھیں واضح ہوچکی تھیں اور آنسوؤں کا ایک دریا بندھ چکا تھا۔ وہ اتنا رو رہی تھی کہ اس کے ہونٹ بھی کپ کپا رہے تھے اور اس کی ہچکی بندھ رہی تھی اس کے سفید گال بخار سے تپ کر سرخ ہو رہے تھے لیکن وہ اپنی دُعا کو جاری رکھتے ہوئے کب سجدے میں گری اس کو سکون کی وادی نصیب ہوئی اور وہ وہیں جائے نماز پر ہی سو گئی۔

یہ اللہ کی طرف سے معجزہ ہوتا ہے آپ چاہے ہسپتال بھی جا کر دیکھ لیں ساری رات درد میں تڑپنے والے بھی فجر کے وقت سکون میں ہوتے ہیں اور ہر طرف اللہ کا نور برس رہا ہوتا ہے۔ اور یہی درخشاں نور کے ساتھ ہو رہا تھا۔

وہ خوابوں کے سمندر میں دور کہیں کہکشاں کے بیچ ستاروں کی مدد سے اپنا گھر تعمیر کر رہی تھی۔ فلک اسے اپنا دکھائی دے رہا تھا اور وہ انہی کے درمیان دور کہیں گھوم رہی تھی کہ اچانک پاس کی مسجد سے ''اللہ اکبر'' ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی اور یوں درخشاں نور پھر سے نماز فجر کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

نماز فجر کے بعد وہ پھر سے دبے پاؤں چلتی ہوئی اپنے بیڈ تک آئی اور خود کو بستر پر گرا دیا۔ اُس کا ذہن اسے گزشتہ روز ہونے والے واقعے کی یاددہانی کرا رہا تھا مگر دوائی کا

اثر ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھت کو گھورتی اور کبھی اس کی بوجھل پلکیں اُس بات سے اُلجھ کر آخرکار تھک کر سو گئیں۔

باب 6

دیوتا نے بھی ساری رات اسی کرب میں گزاری۔ کئی دفعہ نور کا نمبر اپنے موبائل میں ڈائل کرنے کے بعد اس نے مٹا دیا۔

بہت ہمت کر کے Message ٹائپ کیا مگر پھر Unsend کا بٹن دبا دیا۔ اس کا وقار اور مرتبہ ہر بار جیت جاتا اور اس کا دل ہار گیا۔ وہ بڑی شدت سے صبح کا انتظار کر رہا تھا تا کہ فیکٹری جا کر نور کی طبیعت کا حال معلوم کر سکے آج وہ معمول سے ہٹ کر چھ بجے ہی فیکٹری نکل گیا۔

آفس میں جاتے ہی سامنے کرسی پر اُسے نور کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کیسا احساس ہے جو مجھے ایک پل بھی سکون نہیں لینے دے رہا؟ وہ خود سے ہی سوال کر رہا تھا۔

صبح نو بجے کے قریب جب اکرم دیوتا کو چائے دینے آیا تو دیوتا نے کہا ''سپروائزر مس نور کو اندر بھیجوا۔''

''جی سر میں ابھی بھیجتا ہوں'' یہ کہہ کر اکرم چلا گیا اور یہاں دیوتا کے اندر انتظار کی آگ کی شدت مزید بھڑک اٹھی وہ بے تابی سے اکرم کا انتظار کرنے لگا۔

اکرم پورے سترہ منٹ بعد واپس آیا اور کہا: ''سر مس نور نہیں آئیں آج۔ اُس کے ساتھ فائقہ نامی ایک لڑکی نے بتایا کہ مس نور کے پاس اس کا کام کرنے کا سامان ان کے بیگ میں رہ گیا تھا تو آج صبح آتے وقت اس نے کال کی تو پتہ چلا کہ مس نور کی طبیعت ٹھیک نہیں ان کی امی نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اسے ذہنی دباؤ کا کہا ہے۔

چنانچہ وہ کچھ دن تک فیکٹری نہیں آئے گی جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتی۔''

''ٹھیک ہے اکرم تم جاؤ اور تیاری کرو آج ہمارا بہت کام ہے اور سارے لڑکوں کو کہو کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں جب تک فلیکس بن کر آ جاتے ہیں۔'' ''جی سر میں بتا دیتا ہوں'' یہ کہہ کر اکرم چلا گیا۔

دیوتا نے اپنا فون اٹھایا اور بہت دیر تک اسی کشمکش میں رہا کہ اُسے نور کو کال کرنا چاہیے یا نہیں مگر اب کے بار پھر اس کی انا اور عزت نفس جیت گئی۔

کسی نے سچ ہی کہا کہ محبت میں ہمیں اپنی عزتِ نفس اور انا کی قربانی دینی پڑتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی قربانی محبت سب سے پہلے مانگتی ہے باقی چیزیں بعد میں آتی ہیں۔

خیر دیوتا آفس سے اُٹھ کر چلا گیا۔

اُدھر نور درخشاں اپنے بستر پر نیم دراز گہری سوچوں میں مبتلا تھی شاید اسے بھی انتظار تھا کہ دیوتا کسی نا کسی طرح اس کی خیریت ضرور دریافت کرے گا۔ پھر وہ اسے اپنا وہم کہہ کر اپنی ڈائری اور قلم اُٹھا کر لکھنا شروع ہوئی تو پروین شاکر کی نظم لکھ ڈالی:

اتنا معلوم ہے مجھ کو
اپنے بستر پر بہت دیر سے نیم دراز
سوچتی ہوں میں کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا
میں یہاں ہوں مگر اُس کوچۂ رنگ و بو میں
روز کی طرح سے آج بھی آیا ہوگا
اور جب اُس نے مجھے وہاں نہ پایا ہوگا!؟

آپ کو علم ہے، وہ آج کیوں نہیں آئی؟
میری ہر دوست سے پوچھا ہوگا

کیوں نہیں آئی وہ کیا بات ہوئی ہے آخر
خود سے اس بات پہ سو بار وہ اُلجھا ہوگا
کل وہ آئے گی تو میں اُس سے نہیں بولوں گا
آپ ہی آپ کئی بار وہ روٹھا ہوگا
وہ نہیں تو بلندی کا سفر کتنا کٹھن ہے
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے سوچا ہوگا
راہداری میں ہرلان میں پھولوں کے قریب
اُس نے ہر سمت مجھ کو ڈھونڈا ہوگا

نام بھولے سے میرا کہیں آیا ہوگا
غیر محسوس طریقے سے وہ چونکا ہوگا
ایک جملے کو کئی بار سنایا ہوگا
بات کرتے ہوئے سو بار وہ بھولا ہوگا
یہ جو لڑکی نئی ہے، کہیں وہ تو نہیں
اُس نے ہر چہرہ یہی سوچ کر دیکھا ہوگا
جانِ محفل ہے، مگر آج، فقط میرے بغیر
ہائے کس درجہ وہی بزم میں تنہا ہوگا
کبھی سناٹوں سے وحشت جو ہوئی ہوگی اسے
اُس نے بے ساختہ پھر مجھ کو پکارا ہوگا
چلتے چلتے کوئی مانوس سی آہٹ پا کر
دوستوں کو بھی کسی عذر سے روکا ہوگا

یاد کر کے مجھے نم ہوگئی ہوں گی پلکیں
''آنکھ میں پڑ گیا کچھ'' کہہ کر ٹالا ہوگا
جب ملی ہوگی میری علالت کی خبر
اُس نے آہستہ سے دیوار کو تھاما ہوگا
سوچ کر یہ، کہ بہل جائے پریشانی دل
یونہی بے وجہ کسی شخص کو روکا ہوگا!

اتفاقاً مجھے اُس شام مری دوست ملی
میں نے پوچھا کہ سنو! آئے تھے وہ؟ کیسے تھے؟
مجھ کو پوچھتا تھا؟ مجھے ڈھونڈا تھا چاروں جانب؟
اُس نے اِک لمحے کو دیکھا مجھے اور پھر ہنس دی
اس ہنسی میں تو وہ تلخی تھی کہ اس سے آگے
کیا کہا اُس نے۔ مجھے یاد نہیں۔ لیکن
اتنا معلوم ہے، خوابوں کا بھرم ٹوٹ گیا

نور درخشاں اپنے ہی دنیا کے رنگوں کا خواب بننے میں اس قدر مگن تھی کہ اسے یہ بھی خیال تک نہ آیا کہ وہ شخص شادی شدہ ہے وہ بس اُسے چاہے جا رہی تھی اور اس سے کسی رشتے کی امید کیے بغیر خوابوں کے جہاں میں اُسے اپنا شہزادہ تصور کر رہی تھی جو صرف اور صرف اُسی کے لیے بنایا گیا ہو۔ جبکہ آلو، قیمہ کا علیحدہ ہونا ایک حقیقت تھی۔ مگر پیار کرنے والے حقیقت پسند کہاں ہوتے ہیں۔ حرف در حرف جذباتی ہوتے ہیں!

باب 6

خان بابا پودوں کو پانی لگا رہے تھے اور دیوتا سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا دھوپ لیتے ہوئے انگریزی اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔

خان بابا نے جب دیکھا کہ آج چھٹی کا دن ہے اور دیوتا گھر پر ہی ہے تو موقع کی غنیمت جان کر خان بابا نے کہا: ''بیٹا دیوتا!''

دیوتا نے اخبار کو بند کرتے ہوئے خان کی طرف توجہ کی ''جی خان بابا! آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں بیٹا کافی دن سے گاؤں بہت یاد آ رہا ہے۔ دل ہے کہ ایک چکر لگا آؤں۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے بچوں کو دیکھ لوں گا خیریت معلوم کرلوں گا تو دل خوش ہو جائے گا۔''

خان بابا نے بات کرتے اپنے سر سے سفید پگڑی اتاری اور اُس سے اپنے گیلے ہاتھوں کو صاف کرنے لگا۔

دیوتا غور سے خان بابا کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ''کیسا انسان ہے اس کے بیٹوں نے اسے زمین کے چند ٹکڑوں کے لیے گھر سے نکال دیا اور یہ آدمی پھر بھی اپنے بچوں کے لئے تڑپ رہا ہے۔ شاید اولاد کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔'' دیوتا بھی اپنی شفقت کی وجہ سے اپنے بچوں کے لیے کھانا تک بھول جاتا تھا۔ ہر کوئی ماں کی ممتا کے گیت تو گاتا ہے مگر باپ کی کسی کو یاد نہیں رہتی۔ باپ ایک ایسا سورج ہے جس کی روشنی سے گھر کا آنگن چمکتا ہے باپ ایک درخت کی مانند ہے جو ہر وقت تو نہیں مگر ہر موسم میں پھل دینا نہیں بھولتا۔ باپ کی شفقت اور پیار ہی ہوتا ہے جس سے انسان صحرا میں بھی خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ ''بیٹے'' خان بابا نے خود ہی دوبارہ بات شرع کر کے دیوتا کی سوچوں سے دیوتا کو آزاد کیا۔

اس پر دیوتا نے اپنے شرٹ کی سامنے لگی جیب میں سے پانچ ہزار روپے نکال کر خان بابا کو دیئے اور کہا: ''خان بابا کوشش کریں کہ کل شام تک واپس آ جائیں۔''

خان بابا نے پیسے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا: ''ہاں بیٹے تم فکر مت کرو، میں کل جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ فریج میں سالن بنا کر رکھ دیا ہے۔'' دیوتا نے ہلکی سی مسکراہٹ پر اثبات میں سر ہلا دیا۔

دیوتا نے خان بابا کو گیٹ سے باہر جاتا ہوا دیکھا اور پھر سے اخبار میں غرق ہو گیا۔

پھر اچانک ہی اسے نور کے احساس نے دوبارہ گھیر لیا مجھے اسے ایک کال کر کے حال ضرور پوچھنا چاہیے تھا۔

پھر اس نے بغیر سوچے سمجھے جلدی سے نور کا نمبر نکالا اور کال ملا دی۔

دوسری ہی بیل پر کال اُٹھالی گئی تھی۔ نور تو پہلے ہی اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔

دیوتا: ''ہیلو کیسی ہو مس نور؟''

نور: ''جی سر میں ٹھیک ہوں۔''

دیوتا: ''پرا کرم بتا رہا تھا آپ ٹھیک نہیں ہیں کوئی ذہنی دباؤ ہے آپ کے ذہن پر؟''

نور: ''نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں ہلکا سا بخار تھا، اب تو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

دیوتا: ''آپ چاہیں تو کچھ دن آرام کر سکتی ہیں جب تک آپ مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتیں۔''

نور: ''نہیں سر میں کل سے کام پر ضرور آؤں گی میری وجہ سے فیکٹری کا نقصان ہوگا۔ اور ہمارے پاس دوسری سپروائزر بھی نہیں۔''

دیوتا: مسکرا دیا ''چلیں جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''

نور: ہلکی سی مسکراہٹ نور کے لبوں کو بھی چھوگئی چند لمحے خاموشی رہی۔

دیوتا: ''آپ ہی ہیں ناں مس نور؟''

نور: ''جی سر۔''

دیوتا: ''تو کوئی بات کریں خاموش کیوں ہیں؟''

نور: سر!(خاموشی)

دیوتا: ''آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں مس نور؟''

نور: ''جی سر میں اُس دن کے سوال پر شرمندہ ہوں مجھے آپ سے اتنا پرسنل سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

دیوتا: دیوتا نے گہری سانس لی اور پھر کہا: ''آپ ابھی تک اُسی سوال میں اُلجھی ہیں نور آپ کو اپنی صحت پر فوکس کرنا چاہیے یہ تو محض ایک سوال تھا اور میں کوئی بات اتنی پرسنل نہیں لیتا آپ بھی مت لیں۔''

دور کہیں نور کے اندر توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔نور نے ''جی'' کہہ کر بغیر خدا حافظ کیے فون رکھ دیا اور اتنی شدت سے آنسوؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوا کہ نور کو اپنی آواز دبانے کے لیے اپنے ہی منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا مگر شدتِ درد اتنی تھی کہ سسکیوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔شاید نور کچھ اور امید کر رہی تھی اور امید جب ٹوٹے تو آتش فشاں کا ایک لاوا پھٹنا فطری بات تھی۔

نور روتے روتے رضائی میں منہ دیئے کتنے ہی منٹ روتی رہی اور دوسری طرف فون ابھی تک آن تھا اور دیوتا سب کچھ سُن چکا تھا۔

اور پھر خاموشی چھا گئی اور دیوتا نے کال بند کر دی۔

دیوتا گھنٹوں بیٹھا ہوا پہلے دن سے اب تک سوچتا رہا کہ ایسی کون سی امید میں نے اس لڑکی کو دی ہے جو وہ مجھ جیسے خشک انسان سے اتنی شدت سے امیدیں باندھ چکی ہے۔

جس نے اس کا معصوم دل دُکھا دیا اور اس کی گہری آنکھوں میں نا ختم ہونے والی اشک باری شروع ہوگئی۔

دیوتا خود کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا اور اُسے رہ رہ کر نور کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

اور پھر اچانک فون پر گھنٹی بجی تو دوسری طرف ٹینا تھی ''آج سنڈے تھا آپ نے کوئی کال بھی نہیں کی۔ بچے کب سے ویٹ کر رہے ہیں۔'' ٹینا نے فون اٹھاتے ہی گلے شکوہ کرنے لگی۔

دیوتا نے مسکرا کر کہا: ''میری جان، میں دیر سے اٹھا۔ رات بھی جلدی سو گیا تھا پھر بھی آج دیر سے آنکھ کھلی۔''

کیا ہوا سب خیریت ہے نا؟'' ٹینا کو تشویش ہوئی۔

''ہاں بس معمولی سر درد ہے'' دیوتا نے کہا۔

''کیا مطلب معمولی درد ہے آپ نے کوئی دوائی لی؟ چلیں ابھی اٹھیں میڈیسن لیں اور آرام کریں ہم شام میں بات کرتے ہیں۔''

''ہاں میری جان میں ٹھیک ہوں'' دیوتا مخصوص انداز میں ٹینا کو ''میری جان'' کہہ کر بلاتا تھا اور ٹینا اسی بات پر موم ہو جاتی۔ دیوتا اور ٹینا ایک ہی یونیورسٹی میں تھے جب دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور دیوتا نے ٹینا کو ساری یونیورسٹی کے سامنے پرپوز کیا۔ اسی طرح ڈگری مکمل ہوتے ہی دونوں کے گھر والوں نے ان کی شادی کر دی۔

دیوتا کو ٹینا بہت عزیز تھی وہ چاہ کر بھی اپنی محبت سے کسی صورت بے وفائی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس کے لیے اُس نے وطن چھوڑا تا کہ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں ڈال دے۔ دیوتا بہت ہی تخلیقی اور پریکٹیکل انسان تھا۔ وہ اپنے کردار کو اپنے گفتار اور اعمال سے ظاہر کرنے والا انسان تھا۔ یہی خوبی اُسے باقی مردوں سے ممتاز کر دیتی تھی۔

فون بند ہوتے ہی دیوتا نے ٹینا کی ہدایت کے عین مطابق سر درد کی دو گولیاں کھائیں اور سو گیا۔

جب وہ دوبارہ اُٹھا تو عشاء کی اذانیں پورے سیالکوٹ میں ہو رہی تھیں۔

وہ اپنے بستر سے اٹھا اور شیلف سے ''The death of Hero'' کی بک نکال کر پاس ہی پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

آج دیوتا کے ہاتھ میں ''The death of Hero'' کتاب کا دوسرا حصہ تھا اور وہ اُسے پڑھنے کے لیے تجسس سے کہانی کو شروع کر دیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ جارج کی لندن کی زندگی سے متعلق ہے............خود کو سوشلسٹ سوسائٹی میں شامل کرتا ہے اور جارج............جدید فلسفوں سے منسلک ہونے لگتا ہے۔

جارج کو الزبتھ نامی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے مگر شادی کے دور تک آثار نظر نہیں آتے۔ آخر کار اُن کی چھپ چھپ کر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر سب سے مخالفت اختیار کر کے شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں کیوں کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جارج اور الزبتھ شادی کا خاصہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی جارج اور الزبتھ اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن رہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح سے خوش ہیں۔

پھر الزبتھ کی ایک دوست ہی اِن دونوں کے درمیان آجاتی ہے اور جارج الزبتھ کی لازوال محبت کو بھلا کر الزبتھ کی قریبی دوست سے محبت کرنے لگتا ہے۔

ان کی شادی اب مزید برقرار نہیں رہ سکتی کیونکہ الزبتھ اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ شیئر کرنا برداشت نہیں کر سکتی اور الگ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اور حالات خاصے

خراب ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف انگلینڈ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جارج نے آرمی میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یوں کتاب کا دوسرا حصہ اختتام پذیر ہوا اور دیوتا وہیں تکیے پر سر رکھ کر نیند سے پہلے آنے والی خاموش لہر کو اپنے دماغ میں محسوس کرنے لگا اور جلد ہی سو گیا۔

باب 7

ادھر خان بابا اپنے گاؤں پہنچا تو عجیب منظر تھا۔ عیسائیوں کی بستی کو آگ لگا دی گئی۔ خان بابا نے جب اپنے قریبی دوست یار محمد سے پوچھا ''کہ ماجرہ کیا ہے؟ اور یہ سب کیسے ہوا؟'' تو یار محمد نے ساری کہانی کھول کر خان بابا کے سامنے بیان کر دی، ''بڑا ظلم ہو گیا یار رحیم بخش مت پوچھ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ قریبی سکول میں صاف صفائی کا کام کرتا تھا اس کا مذہب عیسائیت تھا۔ سکول سے جاب چھوٹ جانے کے بعد اپنی پانچ بچیوں اور ایک بیٹے کی کفالت وہ شکر قندی کی ریڑھی لگا کر کرتا تھا۔ وہی سکول کے باہر ہی۔'' یار محمد نے چائے کے دُکان پر بیٹھے ہوئے بنچ پر درختوں کے بیچ سکول کی طرف جانے والے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

خان بابا توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا اور کبھی کبھی ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کا گھونٹ بھی لے لیتا۔

''بس اُس بچارے کی قسمت ہاری تھی کل رات اُس کے گھر میں شادی تھی۔ شادی اُس کے بیٹے کی تھی۔ اس کا معمول تھا جب وہ سکول کے باہر بچوں کو شکر قندی بیچتا تو اُن کو دینے کے لیے وہ غریب ہونے کی وجہ سے کاغذ میں ہی رکھ کر شکر قندی دے دیتا ۔سکول کے بچے بھی کبھی کبھی اپنی پرانی کتابیں دے کر شکر قندی لے جاتے اور وہ خوشی خوشی یہ سودا قبول کر لیتا۔ جب کام ختم ہو جاتا وہ گھر جاتے ہی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق قرآنی آیات اور اللہ نبی کریم کے نام دیکھ بھال کر کتابوں میں وہ صفحات نکال کر گھر کے اندر بنائے ہوئے ایک ڈبہ میں محفوظ کر لیتا تا کہ کل کوئی مسلمان دیکھ کر یہ نا سمجھے کہ وہ قرآن اللہ نبی کے نام کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ وہ تو اپنا کام پورا کرتا رہا مگر اُس رات شادی میں بچوں کے ہاتھ

وہ ڈبہ لگ گیا وہ اس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر دیکھا دیکھی بڑوں کی نوٹوں کی؛ برسات کرتے اور سارے پھر سے اِن کو اکٹھا کرتے۔'' خان بابا نے آدھا ہی چائے کا کپ ابھی تک پیا تھا وہ بھی نیچے رکھ دیا۔

''پھر بچوں کا کھیل کب ایک طرف سے ختم ہوتا ہے جب باقی بچوں کو پتا چلا تو ڈبہ خالی کر کے ہی چھوڑا اور گلی میں آ کر یہ کھیل تماشا کرنے لگے۔'' یار محمد رُک کر پھر بولا۔

''پھر اپنی گلی میں مولوی صلاح دین ہے نا؟'' یار محمد نے خان بابا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اُن کا بڑا بیٹا آج کل امام مسجد ہے رستے میں جاتے ہوئے کہیں اُس کے ہاتھ ایک اللہ نبی کریم کے نام کا ٹکڑا لگا تو اس نے سارے گاؤں کے معتبر آدمی اکٹھے کر لیے مسجد میں اعلان کر دیا سارے مسلمان جوق در جوق فصیل کے گھر کے باہر اکٹھے ہو گئے۔''

''ادھر سے لڑکیاں مہندی لے کر آ رہی تھیں ان کے ساتھ ہی گھر گجر سلمان احمد کا خود تو مر گیا اچھا انسان تھا مگر اولاد بدالخاص اور اعلیٰ درجے کی بے نسل نکلی۔ لڑکیوں کو شراب کے نشے میں دھند ہو کر چھیڑنا شروع کر دیا۔ اپنی ماں کی عمر کی فصیل کی بھاوج پر نوٹوں کی بارش کر دی۔ اُن کے دوپٹے اُتار کے اُن کا مذاق بنانے لگے۔ عورتوں کی اس قدر بے حرمتی کہ مجھے ایسے مسلمان ہونے پر شرم آ رہی ہے۔ کیا یہ پیغام دیا ہمارے نبی کریم ﷺ نے کہ عورتوں سے پردہ تک چھین لیں۔''

''بات یہاں کہاں ختم ہوئی ادھر سے کچھ لوگوں نے فصیل اور اس کے بھائیوں کے گھر کے علاوہ ساتھ اس کے 17 گھروں جس میں اس کے رشتہ داری اور قریبی دوست احباب کے گھر شامل تھے، سب کو عیسائیت کے نام پر نبی کریم ﷺ کی ذات اور ناموسِ رسالت پر مولوی حضرات نے فتوہ دے دیا کہ ان کو اس گاؤں سے ہی ختم کر دو اور پھر ہر کوئی جو خود کو مسلمان کہہ رہا تھا ان پر وار کرنا اپنا فرض سمجھ رہا تھا اور پھر کچھ اوباش نوجوانوں نے کہیں سے ایک ایسا تیزاب منگوایا تھا کہ جس گھر پر بھی وہ تیزاب پھینکتے دور سے تو آگ کا

ایک شعلہ بلند ہو جاتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگوں کے گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ فصیل کا بوڑھا باپ چل بسا۔''

یار محمد نے پگڑی سر سے اتار کر گود میں رکھی، اور اپنے دونوں ہاتھ بے جان گھٹنوں پر رکھ دیئے۔

خان بابا نے گہرا سانس لیا اور کہا: ''کس قدر ناانصافی ہے کسی غریب کے ساتھ یہ لوگ قرآن کی اس آیت کو کیسے بھول گئے جس میں اللہ پاک واضح طور پر بیان فرما رہے ہیں۔''

مَن قَتَلَ نَفْسًا بخیر نفسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرض فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعاً۔ (المائدہ5.32)

(جس نے کسی دوسرے کو قصاص کے بغیر یا زمین میں فساد پھیلانے کے لیے یا کسی اور وجہ سے قتل کیا تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کیا)

''یہ اللہ کے فرمان کو بھول کر خود شراب نوشی مکاری اور عورتوں کی عزت ناموس کو خراب کر رہے ہیں۔ یہ کیسے مسلمان ہیں؟ ہمارے نبی کا درس یہ تو ہرگز نہ تھا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ نے تو غیر مذہب کے لوگوں کے ساتھ بھی وہ سلوک روا رکھا کہ وہ خود کلمہ گو ہوئے۔''

خان بابا نے پھر سے نم آنکھوں سے قرآن کی آیت پڑھی۔

''مذہب میں کوئی جبر نہیں'' سچائی غلطی سے واضح ہے (قرآن 2.256)

''اور قرآن کی آیت نمبر 18.29 یہ ظاہر کرتی ہے اسلام کسی بھی مذہب کے لوگوں کے ساتھ جبری تبدیلی کی ممانعت کرتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی خان بابا اُٹھے اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے فصیل کے گھر کی جانب چل دیئے۔ فصیل جو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا پولیس کے آنے کے بعد وہ اپنے گھر میں

دوبارہ آ گیا تھا۔ پولیس بھی معمولی کاروائی کر کے چلتی بنی تھی۔ یہ ساری بات فصیل نے خود خان بابا کو بتائی۔

پھر خان بابا نے اس کی چھوٹی بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نم آنکھوں سے اپنی پگڑی سے اپنے آنسو صاف کئے۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہی پانچ ہزار کا نوٹ جو کل دیوتا نے آتے ہوئے خان بابا کو دیا تھا فصیل کی بیٹی کو پکڑا دیا۔

فصیل کے بتانے پر خان بابا کو پتہ چلا کہ اُس کے باپ کی بہت بُری طرح جھلس جانے کے باعث تدفین بھی مشکل سے ہوئی۔ اُس کے بیٹے کی ایک ٹانگ جل گئی۔ اُس کے گھر کی چھت گرنے کے قریب تھی اور سارا ضروری سامان فرنیچر، کپڑے، برتن، جو اس نے پائی پائی جمع کر کے بنائے تھے جل کر راکھ کر منظر بنے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے فصیل نے اپنے بیٹے کا وہ کمرہ بھی دکھایا جس کو اس کی آنے والی نئی دلہن کے لیے سجایا گیا تھا وہاں صرف اب اندھیرا اور راکھ تھی۔ فصیل دیر تک روتا رہا اور خان بابا اپنے ایسے مسلمان ہونے پر شرمسار ہو رہے تھے جو کسی ناحق کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور خان بابا کے دماغ میں رہ رہ کر ایک حدیث شریف آ رہی تھی:

''جہاں کہیں ظلم ہوتا دیکھو تو اُسے ہاتھ سے روکو اگر ہاتھ سے روکنے کی ہمت نہیں تو زبان سے روکو اور اگر زبان سے روکنے کی بھی ہمت نہیں تو دل میں بُرا کہو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

خان بابا شہر واپس آتے سارے راستے خود سے سوال کرتے رہے کیا میں ایمان کے کمزور ترین درجہ پر فائز ہو چکا ہوں؟ کیا میں کمترین ہوں!!

باب: 8

دیوتا نے اپنے مخصوص انداز میں فیکٹری کی ماہانہ میٹنگ کی شروعات کی۔

"As every one knows that "Dex" is now Pakistan's No. 1 factory. We are manufacturing and export lather garments since 1990. We are exporting all over the European countries and Canada is our main hub. And I'm proud of you all. We have highly qualified staff who look after production flow. I personally engage and timely visit all departments to maintain our qualities. Our main target is our high qualities and we will not compromise to our qualities."

دیوتا یہ بات کرتے ہوئے کھڑا ہو چکا تھا اور فیکٹری کے تمام مزدوروں کو دیوتا آج کافی غصہ میں دکھائی دے رہا تھا۔ نور بھی نوٹ کر رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑ بڑ ضرور ہوئی ہے ورنہ اس شخص کو کسی معمولی بات پر غصہ نہیں آتا۔

دیوتا نے مزید 15 منٹ اسی بات کو دُھرایا کہ فیکٹری میں کسی بھی کوتاہی کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور اس کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کروں گا اور اِس میں مجھے آپ سب کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ ہمیں All Efforts کرنی ہیں۔

میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ سب اُٹھ کر چلے جا رہے تھے۔ دیوتا کے حکم کے مطابق

سب اپنا اپنا کام کریں مگر دیوتا نے دو Departments کے ہیڈز کو روک لیا۔ یہ دونوں حامد اور رضوان goods سپلائی کے شعبہ سے وابستہ تھے۔

دیوتا نے Canada جانے والے سامان کی ساری فہرست حامد اور رضوان سے مانگی اور ساتھ Quality کی لسٹ فائل لے کر دفتر میں آنے کے لیے کہا اور پھر میٹنگ روم میں صرف حامد اور رضوان رہ گئے تھے۔

حامد نے رضوان کی طرف دیکھا وہ دونوں پریشان دکھائی دے رہے تھے اِن دونوں نے مل کر فیکٹری کے سپلائی سامان میں جو بھی کھپلا کیا تھا اِن کو امید نہ تھی کہ دیوتا اتنی جلدی اِن کے کالے کرتوتوں سے پردہ فاش کردے گا۔

چند ہی لمحوں بعد اکرم میٹنگ روم میں داخل ہوا اور اُن کو دیوتا کا پیغام دیا کہ ''سر بہت غصے میں ہیں اور آپ دونوں کو فائل سمیت اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔''

بغیر فائل اور لسٹ کے ہی حامد اور رضوان دیوتا کے سامنے حاضر تھے۔

دیوتا نے فائلز کا نہیں پوچھا بلکہ فائل دیوتا کے میز پر پہلے ہی سے موجود تھی۔

اب وہ دونوں نظریں جھکائے دیوتا کے سامنے اپنی غلطی پر شرمندہ تھے۔

مگر دیوتا فیکٹری کے کاموں میں کوتاہی برداشت نہیں کرتا تھا۔اس نے اسی وقت حامد اور رضوان کو dismiss کردیا۔

رضوان اور حامد نے بہت کہا: ''سر ہم پرانے کام کرنے والے ہیں، ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہمارے ساتھ ایسے مت کریں ہم کیا کریں گے؟

دیوتا نے کہا یہ تو بڑا کام کرنے سے پہلے سوچنا تھا کہ حرام کا مال اپنے بچوں کو کھلا رہے ہو۔ ''سر سر ہمارے ساتھ ایسے مت کریں'' رضوان نے کہا مگر دیوتا اپنی بات مکمل کر کے Visit کے لیے نکل چکا تھا۔

رضوان اور حامد بھی غصے سے اُٹھ کر اپنے آفس میں واپس آ گئے اور پھر دونوں

نے مل کر فیصلہ کیا کہ ''اس شخص نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے۔ہم فیکٹری اونر سے بات کریں گے ایک دفعہ اونر سے بات بن گئی اور ہم اس فیکٹری میں رہ گئے تو اس شخص کو نکالنا ہی ہمارا مشن ہوگا'' حامد نے کہا۔

اس پر رضوان نے کہا: ''میں بھی اپنی تذلیل کا بدلہ اس سے لے کر ہی چین سے بیٹھوں گا۔''

ایک دفعہ مالک سے تو بات کرلیں پہلے۔ پھر اِن دونوں نے فیکٹری کے چھ سات آدمی اپنے ساتھ ملا کر فیکٹری اونر کو کال کی اور ساری صورتِ حال اُلٹ کر دی اور کہا ''سر اگر ہم ہی فیکٹری چھوڑ دیں پرانے بندے ہیں تو سوچیں فیکٹری کا کیا ہوگا؟''

''مگر دیوتا مسلسل ہمیں نکالنے پر تُلے ہوئے ہیں۔'' اس پر فیکٹری اونر نے ان کو تسلی دی اور کہا کہ وہ ابھی دیوتا سے بات کرتا ہے۔

''پر سر آپ کو ساری صورتِ حال کا علم نہیں۔''

دیوتا نے فیکٹری اونر کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا مگر اس نے کہا: ''دیوتا دیکھو یہ لوگ پرانے ہیں اُن کو نکالنے کا مطلب فیکٹری کا نقصان ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم حق پر ہو مگر کوشش کر کے ان کو بحال کرواور یہ ساری ذمہ داری اور کوتاہی تو تمہاری تھی کہ جس نے صورتِ حال یہاں تک پہنچا دی۔تم نے پہلے کیوں نہیں توجہ دی اب اس موقع پر اُن کو ایک ساتھ نکالنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ان کے ساتھ ساتھ اور لوگ بھی ہیں یہاں اور مجھے امید ہے کہ اگر اس معاملہ کو یہاں نہ روکا گیا تو ہوسکتا ہے یہ مزید لوگوں کو ساتھ ملا کر فیکٹری میں بدنظمی پیدا کریں گے اور فیکٹری کی ساکھ کو نقصان پہنچائیں گے۔اس لیے یہی دانشمندی ہے کہ ابھی ان کو نہ نکالا جائے۔''

''دیوتا نے ہاں میں تائید کر دی۔''

دیوتا نے اُن کو مالک کے کہنے پر بحال تو کر دیا مگر اپنے لیے مشکلات کے پہاڑ

کھڑے کر لیے۔ کیونکہ حامد اور رضوان کی نیت پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہو چکی تھی اور اب وہ دیوتا سے ہر حال میں بدلہ لینا چاہتے تھے مگر کسی موقع کے انتظار میں تھے۔

دیوتا گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا تو نور بھی نکل رہی تھی۔ دیوتا نے نور کو دیکھ کر گاڑی کے اندر سے بیٹھے ہوئے کہا۔

''آئیں نور میں آپ کو ڈراپ کر دوں ویسے بھی سردی بہت ہے آپ کہاں بس سٹاپ پر انتظار کریں گی'' دیوتا نے نور کی مدد کے لیے کہا تھا اور دوسرا وہ نور کے دل سے باقی امید بھی ختم کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اسے خیال تھا کہ کوئی اس کی وجہ سے راتوں کو نہیں سوتا اور آنسو بہاتا رہتا ہے۔

نور نے رسمی سے کہا: ''نہیں سر آپ جائیں میں چلی جاؤں گی۔''

دیوتا نے نور کی طرف دیکھا اور اُس کی نظریں التجاء کر رہی تھیں۔

پھر نور چپ چاپ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی نور؟''

دیوتا نے بات شروع کی اور بند گاڑی میں جیسے خاموشی ٹوٹی۔

''جی سر خاصا بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

''اور ذہنی دباؤ میں کوئی کمی آئی؟'' ''دیوتا نے دوسرا سوال کر دیا۔

سر دباؤ تو زندگی کا حصہ ہے وہ تو کسی بھی انسان کو کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو بھی ہوتا ہوگا۔''

''جی بالکل آپ درست فرما رہی ہیں۔ مجھے بھی ہوتا ہے مگر ہر انسان اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ وہی پا سکتا ہے جو باہمت ہو اور مجھے پتہ ہے آپ باہمت لڑکی ہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ کسی بھی دباؤ کو نہیں مانتیں'' اور نور مسکرا دی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک دیوتا کی نظر روڈ پر چلتے ہوئے ایک بزرگ پر

بڑی جو روڈ کراس کرنے کی کوشش میں تھا مگر تیز رفتار گاڑیوں کی وجہ سے روڈ کراس نہیں کر پا رہا تھا۔ دیوتا نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور تیزی سے بزرگ آدمی کے پاس گیا۔

نور حیران تھی کہ دیوتا نے یک دم گاڑی کیوں روکی؟ پھر دیوتا کی طرف دیکھ جو بڑی محنت سے بزرگ آدمی کو روڈ کراس کرانے لگا اور پھر واپس آتے ہوئے بزرگ آدمی نے دیوتا کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور لمبی عمر کی دُعائیں بھی دے رہا تھا۔

نور سانس روکے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں دیوتا کی نرم دلی اور شفقت پر رشک کر رہی تھی۔

دیوتا واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور نور کی طرف دیکھا جو مسلسل ٹکٹکی باندھے ہوئے دیوتا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دیوتا نے نور کی بصارت کی حدت بہت اندر تک محسوس کی اور بے ساختہ مسکرا کر پپوٹے اچکتے ہوئے سوالیہ Body Language استعمال کی۔

اور نور نے شرما کر سر جھکا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور دیوتا اس کے دل کی کیفیت کو محسوس کر سکتا تھا۔

پھر اچانک ہی دیوتا کو چھینکیں آنا شروع ہو گئیں اور وہ ایک کے بعد ایک ٹشو پیپر سے اپنی ناک رگڑ رہا تھا۔

نور سے نہ رہا گیا۔

''مجھے لگتا ہے آپ کو فلو ہو رہا ہے۔ وہ دیکھئے سامنے چائے کا ڈھابہ وہاں رکیے آپ کو اس سردی میں ایک کپ چائے کی ضرورت ہے۔''

دیوتا کو لگا کہ نور کو بھی سردی میں چائے کی طلب ہو رہی ہے شاید تو اس نے چائے والے ڈھابے کے سامنے گاڑی پارک کی اور دونوں گاڑی سے اُتر کر بڑے سے درخت کے نیچے لگے بینچ پر بیٹھ گئے۔

دیوتا کے لیے چائے والے ڈھابے سے یوں چائے پینا پہلا انوکھا تجربہ تھا۔ اور

وہ بھی آج پہلے دن نور کے ساتھ۔ایک بچہ چائے کا آرڈر لے کر جانے لگا تو نور نے کہا کہ ''ایک چائے سادہ اور ایک چائے میں تھوڑی سی ادرک اور جوشاندہ ملا کر لے آؤ۔''

دیوتا حیرانگی سے نور کا دیئے جانے والا انوکھا آرڈر سن رہا تھا پھر نور خود بولی: ''ابھی دیکھئے گا آپ کیسے فوراً سے چٹکی بجاتے ہوئے ٹھیک ہوتے ہیں۔''

نور کو اس قدر خوش اور اس کا خیال رکھنے کا یہ انداز دیوتا کو بھی بھا رہا تھا مگر وہ مسلسل اپنی ناک کو ٹشو پیپر سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔

دیوتا نے نور کی توجہ دوسری طرف ہٹانے کے لیے کہا: ''نور آپ نے کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

نور: ''کیا سر مطلب نہیں سمجھی؟''

دیوتا: ''بھئی اپنے پسندیدہ مشغلے، کالج، سکول، دستوں کی باتیں،'' دیوتا نے جیسے خود ہی نور کو موزوں دیتے ہوئے کہا۔

نور: ''جی سر مجھے پرندے پالنے کا شوق ہے۔ دوست سکول اور کالج میں تھی جو کہ سکول کالج کے بعد ہی ختم ہوگئی۔ نہ کبھی وہ آئی نہ کبھی میں گئی۔ اس کے علاوہ کتابیں پڑھنے کا شوق ہے مجھے شاعری سے لگاؤ ہے خود بھی لکھتی ہوں۔''

دیوتا: ''واہ! کیا خوب! تو پھر ہمیں بھی کچھ سنائیں نا۔''

نور: ''چھوڑیں سر ایسے ہی بس'' نور نے جیسے بات کو معمولی کر دیا۔

دیوتا: ''نہیں بھئی اب تو کچھ سنانا ہی ہوگا۔''

چائے والا لڑکا چائے رکھ کر چلا گیا اور یوں دیوتا نے نور درخشاں کی ہدایت پر بنی ہوئی چائے پینا شروع کی تو اُس کی بند ناک کو کچھ سہارا ملا۔

نور نے کہا: ''جی سر اگر آپ اتنا اسرار کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے مگر آپ کو بعد میں میری تعریف کرنا ہوگی۔'' یہ بات کہہ کر نور مسکرائی اور جیسے ہوا میں ساز بجنے لگے۔ دیوتا وہ

موسیقی جو اس لڑکی کی ہنسی میں چھپی ہوئی تھی محسوس کر رہا تھا اور اس کی سماعت میں رس گھلتا جا رہا تھا۔ پھر نور نے چائے ہاتھوں میں پکڑی۔ ''اے کاش'' کتاب سے ایک نظم ''چاہت'' پڑھنا شروع کی:

جس سے ہو چاہت وہ انجان ہو
شوق چاہت کا یہ اصول نہیں
مگر نہ جانے کس آس پر
چاہت کو ہم نے رکھا برقرار
نہ کوئی نوشتہ دیا اِن کو
نہ کوئی نوشتہ دیوار
خود ہی سہہ رہے ہیں الم
شوق چاہت کا یہ اصول نہیں

نور نظم پڑھنے کے بعد اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چائے کے کپ کے سرے پر اپنی انگلیوں کی مدد سے گول گول دائرہ بنا رہی تھی اور اس کا چہرہ اُداس لگ رہا تھا اور گردن جھکی ہوئی شاید اُس نے ایک نظم کے ذریعے اپنے دل کی حالت دیوتا کے سامنے رکھ ڈالی تھی۔

دیوتا نے گہرا سانس لیا اور کہا: ''بہت خوب بہت اچھا پڑھتی ہیں آپ'' اور پھر دیوتا نے نور کی طرف دیکھا جو کہیں بہت دور سوچوں میں گُم تھی۔

دیووتا کو نور کے کپ پر نور کی لپ اسٹک سے نمایاں impression بہت پُرکشش لگ رہا تھا۔ جو اُسکا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہ کپ ہمیشہ کیلئے سنبھال کر رکھ لے۔

''نور،نور''

دیوتا کے دوبار بلانے کے بعد بھی نور نہیں بولی اور پھر دیوتا نے ایک اور کوشش کی

تو نور نے سوچوں سے نکلتے ہوئے کہا''جی سر آپ نے کچھ کہا؟''

''لگتا ہے کہ آپ ابھی تک ٹھیک نہیں دیوتا نے تشویش سے دیکھتے ہوئے نور کو کہا۔''

اور نور نے خاموشی سے گردن جھکا دی۔

دیوتا نے کہا''نور آپ مجھ سے کچھ نہیں پوچھیں گی؟'' دیوتا جیسے نور کی توجہ بانٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نور نے ہلکی سی مسکان سے دیوتا کی طرف دیکھا اور کہا''آپ سے؟''

دیوتا: ''جی مجھ سے۔''

پھر نور نے سوچتے ہوئے کہا'' آپ مجھے اپنے مذہب کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مجھے بہت شوق ہے مذاہب کے بارے میں جاننے کا۔ پہلے پاکستان میں بھی دینیات پڑھائی جاتی تھی لیکن پھر اُسے اسلامیات کے کوزے میں بند کر دیا گیا۔'' مجھے لگتا ہے کہ یہ موضوع خاصا دلچسپ ہے'' دیوتا نے کہا''احساس ہے مگر میرا دل کرتا ہے'' آپ کے بارے میں جانو اور آپ نے خود ہی تو مجھے کہا ہے میرے بارے میں کچھ پوچھو'' نور جیسے خفا ہوگئی۔

''دیوتا مسکرا دیا اور کہا کوئی بات نہیں مجھے بھی اچھا لگتا ہے کیوں نہیں'' اور پھر دیوتا نے اپنی مذہب تاریخ اور موجودہ دور میں اس کے تناظر میں بات شروع کی۔

''میرا تعلق مذہب بدھ مت سے ہے۔ بدھ مت ایک مذہب اور فلسفہ ہے جو مختلف روایات، عقائد اور طرز عمل پر محیط ہے۔ جس کی زیادہ تر تعلیمات کی بنیاد کا عالم سدھارتھ گوتم بُدھ کی طرف منسوب ہے۔ عام طور پر بدھ سنسکرت (ایک جاگت) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک مذہب بدھ مت بھی ہے۔'' (نور بڑے انہماک سے دیوتا کی باتیں سن رہی تھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے

تھامے ہوئے وہ بالکل سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور بالکل بچی بنی ہوئی تھی کہانیاں سننے کی شوقین)۔

''بدھا چوتھی سے پانچویں صدی قبل مسیح کے درمیان میں شمال مشرقی برصغیر (نیپال) میں رہتے تھے اور تعلیمات دیتے تھے۔ انہیں بدھ مت لوگ ''ایک جاگت'' یا ''روشن خیال استاذ'' کے نام سے مانتے ہیں۔'' بدھا کا لفظ بدھی یعنی عقل سے نکلا ہے۔''

''جبکہ ہم پاکستانی بُدھو احمق کو کہتے ہیں'' نور نے لقمہ دیا۔

''انھوں نے حیات احساس کو مشکلات سے نجات حاصل کرنا نروان کو حاصل کرنا اور تکلیف اور دوسرے جنموں کی مشکلات سے بچنا سکھایا۔''

اب نور اور دیوتا چائے کے ڈھابے کے ساتھ ہی بنے ہوئے پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے دیوتا خاموش ہوا۔

نور نے کہا سر ''نروان اور دوسرے جنم سے کیا مراد ہے؟''

پارک کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ خوبصورت کیاریوں اور درختوں سے مزین تھا۔ دیوتا نے چلتے ہوئے درخت کی طرف گھور کر ایک پتا توڑا اور نور کے سوال کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اپنا علم یکجا کیا:

''ہاں نروان بدھ مت اور جین مت کا ایک اہم تصور ہے روح کی سمسار یعنی جنموں کے سلسلہ سے آزادی حاصل کرنے کو نروان حاصل کرنا کہتے ہیں۔''

''اور سر 'جنم' کا کیا تصور ہے؟''

نور نے اپنی گرم شال کو اپنے کندھوں پر ٹھیک کرتے ہوئے دیوتا کو اپنا سوال یاد کروایا۔

''اصل میں پہلے ہمیں 'تناسخ' کو جاننا ضروری ہے۔ 'تناسخ' یا 'آواگون' ایک ہی مفہوم کے دو ہم معنی ہیں۔''

'تناسخ' کا لفظ اُردو میں عربی زبان سے آیا ہے۔ اور نسخ سے ماخوذ ہے' تناسخ' سے بنیادی طور پر مراد' دوبارہ پیدا ہونے والا' ہے۔ اور اسی تصور کی وجہ سے نسخ سے تناسخ کا لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی' ایک بار موت کے بعد وہ مرنے والی شخصیت ایک مرتبہ پھر تجسیم حاصل کر لیتی' ہے۔ متعدد اوقات اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے'' اہتجار'' کا لفظ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے' Reincarnation' کہتے ہیں۔

حیات بعد الموت ایک الگ سے تصور ہے جو عام طور پر ابراہیمی اَدیان میں پایا جاتا ہے۔''

نور نے کہا جی سر میں نے بھی پڑھا ہے اس کے بارے میں کہ علامہ قرطبی نے رافیضہ کے فرقوں میں سے ایک فرقہ تناسخیہ شمار کیا جن کا عقیدہ ہے کہ:

''ارواح میں تناسخ ہوتا رہتا ہے۔ پس جو محسن اور نیکو کار ہو اس کی روح نکلتی ہے اور ایسی مخلوق میں داخل ہو جاتی ہے جو اپنی زندگی کے ساتھ سعادت اندوز ہو رہی ہوتی ہے۔''

جبکہ یہ بات جنتی زیور میں صفحہ 189 پر برزخ کے عنوان سے عقیدہ: 3 پر لکھا ہے:

''یہ خیال کہ مرنے کے بعد روح کسی دوسرے بدن میں چلی جاتی ہے خواہ وہ کسی آدمی کا بدن ہو یا کسی جانور کا جس کو فلاسفر تناسخ اور 'ہندؤ' 'آوا گون' کہتے ہیں یہ خیال بالکل ہی باطل اور اس کا ماننا کفر ہے۔''

اس بات کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی نور کو یوں لگا جیسے دیوتا کو یہ بات اچھی نہیں لگی تو اس پر نور درخشاں نے کہا سر میں معذرت چاہتی ہوں کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے میرے الفاظ سخت تھے۔

دیوتا نے جاتے ہوئے نور کو کہا ''نہیں نور میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ میں کسی بات کو پرسنل نہیں لیتا آپ بھی نا لیا کریں'' دیوتا بہت خوش مزاج انسان تھا وہ اگر کسی بات کو ناگوار بھی محسوس کرتا تھا تو اس کو دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ یہی وہ آج کر رہا تھا۔

پھر اس نے بات کا موزوں بدلا اور کہا نور اپنے تہواروں کے بارے میں بتائیں کچھ۔

اس سوال پر نور پُر جوش ہوگئی اور کہا ''سر ہمارے بہت پیارے اسلامی تہوار ہیں عیدالفطر، عیدالضحیٰ، شبِ بارات قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بارہ ربیع الاول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت کا دن، اور شبِ معراج ہے۔''

دیوتا، نور کو غور سے سُن رہا تھا۔ اور دلچسپی سے کہا مجھے پاکستان رہتے ہوئے یہ ساتواں سال ہے اور آپ کے کافی تہوار تو نہیں مگر عید کے بارے میں مجھے پتہ ہے یہ خان بابا مجھے بتاتے رہتے ہیں۔

نور نے تھوڑی حیرانگی اور شرماتی ہوئی نظروں سے دیوتا کو دیکھ کر کہا ''چلے اب آپ کی باری آپ بتائیں مجھے۔''

''کیا'' دیوتا نے پارک کے اندر بنے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''بھئی یہی کہ آپ کے کون کون سے تہوار ہوتے ہیں مجھے بہت شوق سری لنکا کی رسومات اور تہذیب کے بارے میں جاننے کا۔''

''فہرست تو بہت لمبی ہے ٹائم ہے تمہارے پاس؟''

دیوتا نے سوالیہ انداز میں درخشاں نور کو پوچھا۔

''جی بالکل ابھی شام ہونے میں وقت باقی ہے آپ بتایئے نا۔''

نور نے ضد کی۔

''آپ کو پتہ ہے سری لنکا تہواروں اور رنگین تقریبات کے لیے مشہور سرزمین ہے۔سری لنکا کے تہوار نہ صرف ملک کی ثقافت اور مذاہب کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ اس کی دلچسپ تاریخ اور خوبصورت روایات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ان میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے تہوار الگ الگ ہیں۔ان میں ویل فیسٹیول جس کو ویل سری لنکا کے نام سے جانا جاتا ہے سب سے اہم ہندو تہوار ہے۔

جو کہ ہندو مذہب کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کی عکاسی کرتا ہے۔ مرکزی تقریبات کولمبو میں ہوتی ہیں جس میں پورے جزیرے سے ہزاروں زائرین آتے ہیں'' دیوتا سانس لینے کو رکا۔

اصل میں یہ خلگی دیوتا سکندھا کے لیے وقف تہوار بڑی طاقتوں پر فتح کی یاد میں منایا جاتا ہے۔اور اس کے ماننے والے (ترشول)، ویل کی پوجا کرتے ہیں۔کولمبو میں مرکزی جلوس کے دوران جو پیٹہ سے شروع ہوتا ہے۔اور بمبلا پیٹہ میں ختم ہوتا ہے۔سکندھا کی ویل کو سونے کی ایک چمکدار رتھ میں رکھا جاتا ہے۔ جسے سفید لباس میں ملبوس سینکڑوں عقیدت مند مقدس راکھ میں رکھتے ہیں۔

مرکزی تقریب کے دوران سینکڑوں موسیقار، رقاص، بازی گر اور ہاتھی شامل ہوتے ہیں جو شہر کے مختلف حصوں میں (سناپ) دُعا کرتے ہیں۔

جلتی ہوئی روشنیاں، بخور اور چمیلی کے پھولوں کی خوشبو، ڈھول کی آواز، گھنٹیاں اور منتر اور رنگ برنگے اداکار لڑکے نکلتے ہیں۔ویل فیسٹیول ایک شاندار اور مسحور کن نظارہ ہوتا ہے۔''

نور غور سے دیوتا کی باتیں سن رہی تھی پھر کہنے لگی''سر یہ ویل فیسٹیول کب ہوتا ہے؟'' دیوتا نے کہا کہ یہ'' جولائی یا اگست میں ہوتا اور میرا ارادہ ہے کہ اس میں اس سال ضرور اپنے وطن جا کر شامل ہو جاؤں۔''

اب دیوتا کہاں رکنے والا تھا۔اس نے اپنے دوسرے تہوار کی روداد شروع کی۔

''نالور فیسٹیول پورے 25 دنوں تک جاری رہنے والا تہوار ہے۔اس میں بھی ہزاروں پیروکار شامل ہوتے ہیں۔سری لنکا میں کندالوامی مندر اس تہوار کا مرکز ہے۔

اس موقع پر مرد سفید رنگ پہنتے ہیں اور عورتیں رنگ برنگی ساڑھیاں پہنتی ہیں جو مندر کے احاطے کو متحرک رنگوں کے سمندر میں تبدیل کر دیتی ہے۔لوگ ڈھول کی تھاپ پر مندر پر رقص کرتے ہوئے جاتے ہیں اُن کے مطابق خُدا ایوان کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھے گا۔اس کا آغاز اگست میں ہوتا ہے اور ستمبر کے اندر ختم ہو جاتا ہے جافنا اس کا مرکزی مقام ہے۔''

نور نے کہا ''سر یہ ساری باتیں میرے لیے عجیب مگر معلوماتی ہیں۔''

''جی نور ابھی تو آپ کو ہمارے نئے سال کے تہوار کے بارے میں بتانا ہے جو کہ سب سے دلچسپ ہے۔''

''جی سر ضرور نور اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چہرے کو لیے ہوئے چھوٹی سی معصوم بچی لگ رہی تھی'' اور دیوتا اس کے آنکھوں کے حصار میں گُم تھا۔

پھر دیوتا نے اپنے موضوع پر آتے ہوئے نور کو نئے سال کی تقریب کے بارے میں بتانا شروع کیا:

''ہر سال اپریل کے آغاز میں جزیرے کے اس پار نئے قمری سال کے آغاز میں، عام طور پہ اپریل میں ہوتا ہے۔جہاں سارا جزیرہ رنگین اور ایک متحرک روح کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے۔نئے سال کی تقریبات سے پہلے ہی ہم لوگ اپنے گھروں کی صفائی اور سجاوٹ، روایتی مٹھائیاں اور میٹھے بنا کر اور اپنے پیاروں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور تیار کرتے ہیں۔دعوت خاندان کے مل کر کرنا، آتش بازی اور گلیوں میں کھیل کھیلنا۔''

دیوتا نے نور کو دیکھ کر کہا جو نظریں جمائے پہلے ہی دیوتا کو دیکھ رہی تھی۔''نور اگر

آپ سری لنکا کا دورہ کریں تو وقتِ تہوار بہت پُر جوش ہے تاہم اِن دنوں میں کاروبار بند ہوتے ہیں تاکہ لوگ مل کر اپنے اپنوں کے ساتھ جشن منا سکیں۔'' دیوتا نے نور کو دعوت دی۔

''دیپاولی کا تو آپ کو پتا ہی ہوگا۔''

نور نے مسکرا کر کہا جی سر یہ تہوار فقط معلوم ہے مجھے مگر یہ کیوں منایا جاتا ہے اس بات کا علم نہیں۔

''دیپاولی یا روشنیوں کا تہوار ہندو کیلنڈر کی سب سے اہم تقریبات میں سے اہم تقریب ہے۔اور سری لنکا میں اسے تامل کمیونٹی مناتی ہے۔'' پھر دیوتا نور کے سوال کی طرف آیا۔

''دیپاولی کا نام جنوبی ہندوستان میں دیا جانے والا نام ہے اور شمالی اور دنیا کے دیگر علاقوں میں ''دیوالی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ تہوار بھگوان رام کی رامائن کی شکست کے جشن میں منایا جاتا ہے، جو کہ اندھیرے کی شکست اور برائی پر اچھائی اور مایوسی پر اُمید کی علامت ہے۔''

دیوتا نے نور کو دیکھا جو معصوم سی صورت بنائے اس کی باتیں سن رہی تھی اور دور کہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر وہی دیکھتے دیکھتے نور کی آنکھوں کی چمک بڑھی اور چہرے پر شرارتی مسکراہٹ ٹپک پڑی:

دیوتا نے جب اُس جانب دیکھا تو سامنے آئس کریم والا آئس کریم سائیکل پر پیچھے بڑا سا بکس لگائے ہوئے تھا اور پارک کے اندر کھیلنے والے آس پاس کے بچے اس کے اردگرد آئس کریم کے لیے جمع ہو گئے اور وہ اُن سے پیسے وصول کرنے کے بعد ڈبے میں ہاتھ ڈال کر اُن کی مطلوبہ آئس کریم دے رہا تھا۔

دیوتا اُٹھا اور اُس جانب چل دیا اور نور کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ دیا وہ بھی دیوتا کے پیچھے حیرانگی سے چل پڑی دیوتا جب آئس کریم والے کے پاس آ کر رکا تو نور مسکرائی

نہیں سر رہنے دیں میں تو ایسے ہی......وہ آدھی بات کرنے کی شروع سے عادی تھی۔

اور دیوتا کو اُس کی اس بات پر ہنسی آئی۔

بھئی کچھ نہیں آپ بتائیں کون سی آئس کریم لیں نور۔ میں......

دیوتا۔"جی بتائیں بھی اب۔"

نور"چاکلیٹ آئس کریم۔"

دیوتا نے آئس کریم والے کو اشارہ کیا جو کہ نور کی بات پہلے ہی سُن چکا تھا۔

اس نے آئس کریم کا کپ نکال کر دیوتا کو تھما دیا۔

اور پھر دیوتا نور کو دینے لگا۔

مگر نور نے کہا کچھ نہیں مگر ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔"کیا ہوا نور لیں۔" دیوتا نے جیسے درخواست کی۔

نور:"سر!"

دیوتا۔"جی؟ دیوتا نے سوالیہ انداز سے کہا اور ساتھ حیران بھی تھا۔"

نور نے شرماتے ہوئے کہا"میں تو کون آئس کریم کھاتی ہوں۔"

اوہ میرے خدایا، دیوتا نے کہا بس اتنی سی بات۔

دیوتا نے دوبارہ کپ آئس کریم والے کو دیا اور پھر نور کو چاکلیٹ کون آئس کریم دی پیسے ادا کرنے کے بعد دیوتا اور نور پھر دوبارہ دونوں اُسی بینچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"سر آپ نہیں لیں گے؟"

نور نے کہا۔

"اس پر دیوتا نے کہا اگر آپ کہتی ہیں تو کھا لیتا ہوں لیکن میری ناک پہلے ہی بند ہو رہی ہے۔اور کھانسی بھی محسوس ہو رہی لیکن گلے میں دب کر رہ جاتی ہے۔"

دیوتا نے گلے پر ہاتھ رکھا جیسے کہ اُس کو تکلیف ہو رہی ہو۔

''نہیں نہیں آپ نے تو بالکل نہیں کھائی۔نور کو یاد آ گیا تھا اور اب وہ پہلے والی بات پر شرمندہ تھی اور چلتے ہوئے ہی آئس کریم کھا رہی تھی۔''

دیوتا نور کو بغور دیکھ رہا تھا جو بالکل اس کے چھوٹے بیٹے کی طرح اپنے شرٹ اور بازو کی پروا کے بغیر آئس کریم کھا رہی تھی۔راون نے تو اپنے کسرتی بازوؤں پر tatoo بھی بنوار کھے تھے۔

اور پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سمیت اپنی جرسی پر آئس کریم گرادی اور کسی معصوم بچے کی طرح بے خبر تھی۔

دیوتا دیکھ رہا تھا آئس کریم اُس کے ایک ہاتھ کے باہر والی انگلیوں سے بہہ رہی تھی اور شرٹ کے بازوؤں کے اندر جذب ہو رہی تھی اور وہ بمشکل اپنی ہنسی اور کھانسی کو دبا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے آئس کریم ختم ہوئی تو نور کو خیال آیا کہ دیوتا سے دوبارہ کوئی بات کرے۔

''جی سر پر آپ نے ہندوؤں کے تہواروں کے بارے میں بتایا لیکن بدھ مت کے تہواروں کے بارے میں نہیں بتایا؟''

نور اپنا سوال چھوڑ کر اپنے چپکے ہوئے ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔

کبھی ان کو ساتھ ملاتی اور پھر زور لگا کر جُدا کرتی۔

دیوتا کو دیکھ کر جیسے الجھن ہوئی اُس نے کہا۔

''نور میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں مگر پہلے ہمیں آپ کے ہاتھ دھلوانے کی ضرورت ہے۔''

''اور دیکھیں آپ نے اپنی شرٹ کے بازو بھی گندے کر لیے۔'' نور نے اپنے بازو دیکھے جیسے اُس کو اب احساس ہوا ہو۔اس نے اپنے دونوں ہونٹوں کو آپس میں دبایا اور

پھر شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ دیوتا کو دیکھا۔ جو اُس کو دیکھ کر پہلے ہی مسکرا رہا تھا۔

پھر دونوں اتنا کھلکھلا کر ہنسے کہ جیسے ساری کائنات خاموش تھی اور صرف وہ دونوں اس پوری کائنات میں موجود تھے جو اس کائنات کی رونق اپنی مسکراہٹوں سے بحال کر رہے تھے۔ جیسے سورج غروب ہونا اور چاند طلوع ہونا بھول گیا ہو۔

خاصا دیر دونوں مسلسل ہنستے رہے۔ حتیٰ کہ نور اپنے چپکے ہوئے پیٹ کو پکڑ کر ہنسنے لگی۔ دیوتا نے اپنے بازو کمر پر رکھے ہنستے ہنستے دوھارا ہو گیا۔ ہنستے ہوئے اسے مسلسل کھانسی آ رہی تھی۔

پھر دونوں کو خیال آیا کہ ہنسی کا دورانیہ لمبا ہو گیا تو انہوں نے مسکراہٹ پر بمشکل قابو پایا۔

دیوتا، نور کو لے کر سامنے لگی پانی کی ٹونٹی پر گیا اور پھر نور نے اپنے دونوں ہاتھ اور شرٹ کے بازو تک دھوڈالے۔ اب وہ اپنی ہی شال سے خشک کر رہی تھی۔ اور دیوتا عصر کے بعد سورج کی کیفیت کو دیکھنے میں مشغول تھا۔

دونوں چلتے ہوئے پھر اسی بینچ پر آن بیٹھے اور پھر نور نے اپنا سوال دوبارہ یاد کروایا۔

اس پر دیوتا نے کہا۔

''جی بالکل میں آپ کو بتاتا ہوں۔ بدھ مت کے بھی کئی مذہبی تہوار ہیں'' دیوتا نے فخر کرتے ہوئے بتایا۔

''سری لنکا کے اندر بہت سے مذاہب ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے مذہبی تہواروں کو ذوق وشوق سے مناتا ہے۔

بدھ مت کے ماننے والوں اور منانے والوں کا یہ اہم مذہبی اور ثقافتی تہوار ''ویساک'' قمری مہینے کے پورے چاند پر شروع ہوتا ہے۔

جو کہ گریگورین کیلنڈر پر مئی ہے۔ یہ ہفتہ طویل جشن، جسے روشنی کے تہوار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

بدھ کی پیدائش، روشن خیالی کے حصول اور نروان میں اُن کے انتقال کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ''ویساک'' کے دوران پورا جزیرہ اور خاص طور پر کولمبو، رنگ برنگی روشنیوں اور لالٹینوں کا مرقع بن جاتا ہے۔

جب کہ عقیدت مند راہگیروں کو کھانے پینے کی اشیاء مفت فراہم کرتے ہیں اور اپنی مقامی جگہوں مندروں میں دُعا، روزہ جیسی مذہبی سرگرمیوں کی مشق کرتے ہوئے دن گزارتے ہیں۔

اس تہوار کی خاص بات بدھ مت کے گھر، مندر ہیں۔''

نور درخشاں بولی: ''سر یہ تو واقعی ہی دل کش نظارہ ہوگا۔ مئی میں سری لنکا میں، ویساک دیکھنے والوں کے لیے شاندار اور متحرک تہوار ہے۔''

''جی نور اور اس تہوار کے دوران شراب اور تازہ گوشت کی فروخت عام طور پر ایک ہفتے تک ممنوع ہوتی ہے اور میری یہ خوش نصیبی ہے کہ وہی کا رہنے والا ہوں۔''

''اچھا تو آپ کا تعلق سری لنکا کے شہر کولمبو سے ہے۔ مجھے میڈم آسیہ نے بتایا تھا ایک دن۔'' نور نے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

دیوتا نے کہا۔

''جی کولمبو میں میری بیوی ٹینا اور میرے دو پیارے پیارے بچے راون اور کشور میرے والدین کے ہمراہ رہتے ہیں۔'' دیوتا یہ کہہ کر چپ کر گیا۔

اس بات کو دیوتا نے اپنی نور کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی روانی میں کہا یا جان بوجھ کر مگر اس نے نور کو آج بتا دیا کہ وہ ایک فیملی کا سرپرست ہے اور اس پر ایک گھر کی ذمہ داری بھی ہے۔ دیوتا نے آج نور کو اپنے مذہب سے بھی خوب آگاہ کر دیا تھا تاکہ نور اس

کے لیے کوئی جذبات نہ رکھے کیونکہ دیوتا جیسا شخص اگر کسی کے ساتھ اتنا وقت گزار رہا تھا تو صرف اس لیے تا کہ وہ کسی کی تکلیف کا باعث نہ ہو اور کوئی معصوم لڑکی اُس کی وجہ سے اپنے جذبات مجروح نہ کر لے۔

اب دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گاڑی تک آ چکے تھے اور پھر دیوتا نے گاڑی نور کے گھر کی طرف موڑ لی۔

باب: 9

مغرب کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ سردی کی سرد شام میں سورج جلدی غروب ہو جاتا ہے۔

گاڑی میں نور نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف اپنی شرٹ کے گیلے بازوؤں سے لگی ہوئی تھی اور اُن کو اپنی کلائیوں سے الگ کرنے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اُسے اُن کے گیلے ہونے کی وجہ سے الجھن ہو رہی ہو۔

دیوتا نے نور کی خاموشی کو نوٹ کر لیا اور اب اس کا چہرہ بھی قدرے اُداس لگ رہا تھا۔

پھر دیوتا نے بات شروع کی۔

''نور آج آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ یوں کہہ لیں کہ میں پہلی دفعہ اتنا کھل کر ہنسا ہوں۔ یقین کریں بہت اچھا محسوس ہوا۔''

نور نے مختصر کہا: ''مجھے بھی'' اور پھر سے خاموش ہو گئی۔

''جو چائے اپنی ہدایت پر آپ نے بنوائی اس کے لیے بھی شکریہ اس سے مجھے کافی حد تک افاقہ ہوا ہے۔ بس گلے میں خارش رہ گئی ہے تھوڑی بہت وہ بھی Strepsils لینے سے ٹھیک ہو جائے گا۔''

دیوتا جیسے خالی گاڑی میں خود سے باتیں کر رہا تھا اور نور اب گاڑی سے باہر روڈ کے کنارے لگے ہوئے درختوں کو گھور رہی تھی، جو چلتی گاڑی میں ہر کوئی ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑ رہا تھا۔

اب دیوتا نے قدرے سنجیدہ اور گھمبیر انداز میں کہا:

''دیکھیں نور آج آپ کو خاصی حد تک احساس ہو گیا ہوگا کہ ہمارے مذاہب، رہن سہن، معاشرت، بود وباش میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ میں پاکستانیوں کی اکثریت جیسا منافق ہوتا تو آپکے جذبات سے کھیل جاتا۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔''

''آج یہ ساری باتیں آپ کے پوچھنے پر اسی لیے بتائی ہیں تاکہ آپ میرے بارے میں جان سکیں۔

بعض دفعہ ہم جو دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ ویسا صرف ہمیں نظر آرہا ہوتا تصویر کا دوسرا رُخ وہی آپ کو بتا سکتا ہے جو اس کے بارے میں جانتا ہو۔ اور ویسے تو ہم آج کل اُس زمانے میں جی رہے ہیں اپنے روایت پسندتر لوگوں سے بہت مختلف۔

ہم مفروضے کے سہارے زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ ہمیں حقیقت پسند اور ترقی پسند بننا ہوگا''

دیوتا نے نور کی طرف دیکھا جیسے اپنا جواب طلب کر رہا ہو۔

نور نے سر ہلا کر ''ہاں'' کے انداز میں دیوتا تک یہ بات پہنچا دی کہ وہ اُسے پوری توجہ سے سن رہی ہے۔ نور درخشاں کا گھر آ چکا تھا۔

نور، دیوتا کو دیکھ کر ''خدا حافظ'' کہہ کر بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

دیوتا اُسے دور تک دیکھتا رہا اور پھر گاڑی واپس موڑ دی۔

اُسے نور کی اپنے ساتھ والی سیٹ پر بے انتہا کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جسے وہ بار بار جھٹک رہا تھا۔ نور کی سیٹ سردی کے باوجود ابھی تک گرم تھی۔

نور آتے ہی سو گئی۔ جب دوبارہ اٹھی بی اماں کھانا رکھ کر چلی گئی۔ اس نے چند نوالے بامشکل حلق سے اتارے پھر پروین شاکر کے شعر اپنی ڈائری پر لکھنے شروع کیے:

شکن چپ ہے

بدن خاموش ہے
گالوں پہ ویسی نمناہٹ بھی نہیں، لیکن
میں گھر سے کیسے نکلوں گی،
ہوا، چنچل سہیلی کی طرح باہر کھڑی ہے
دیکھتے ہی مسکرائے گی!
مجھے چھو کر تیری ہر بات پالے گی
تجھے مجھ سے چرالے گی
زمانے بھر سے کہہ دے گی،
میں تجھ سے مل کے آئی ہوں!
ہوا کی شوخیاں یہ
اور میرا بچپنا ایسا
کہ اپنے آپ سے بھی میں
تیری خوشبو چھپاتی پھر رہی ہوں!

گھر آتے ہی دیوتا کو بخار ہونے لگا اور پھر اگلی صبح ہسپتال جانے پر ڈاکٹرز نے دیوتا کو کووڈ پوزیٹو قرار دے دیا۔

دیوتا نے فیکٹری کال کر کے ہدایات کر دی اور پھر دیوتا کو ڈاکٹرز کی ہدایت پر دو دن ہسپتال رہنے کے بعد پندرہ دن قرنطینہ ہونا تھا تا کہ وہ اپنے اردگرد رہنے والوں کو اس بیماری سے بچا سکے۔

پہلے دو دن دیوتا کی ہسپتال میں بخار اور گلے خراب کی وجہ بُری حالت رہی ڈاکٹرز اُسے بنیادی طبی سہولیات دیتے رہے اور خان بابا بھی مسلسل اُن کی خدمت کرتا رہا اور ایک لمحے کے لیے بھی دیوتا کو اکیلا نہیں چھوڑا اور دیوتا کی ہر طرح دور سے رہنے کے

باوجود ڈاکٹرز سے میٹنگ اور سارے معاملات خان بابا کے ذمہ تھے۔

آج دیوتا کی بیماری کو تیسرا دن تھا دیوتا اپنے گھر کے بیڈ پر تھا اور اس کو جسم درد کی مسلسل تکلیف تھی جبکہ بخار میں خاصی کمی آ چکی تھی۔

فیکٹری میں کام کرنے والی خواتین بڑے سلیقے سے جیکٹ کو تہہ لگا کر پیکٹ میں اچھی طرح سے چیک کرنے کے بعد پیک کرنے میں مصروف تھیں اور نور مسلسل تین گھنٹے سے ان کی سخت نگرانی کر رہی تھی تاکہ کوئی کوتاہی نا ہو۔

اب وہ دوسرے وزٹ پر تھی جہاں عورتیں بڑی مہارت سے کٹنگ میں مصروف تھیں نور نے میڈم آسیہ سے تربیت کے دوران یہ ساری باتیں سیکھی تھیں اور اب وہ عملی طور پر ان کو لا رہی تھی۔

وہ ہر عورت پر گہری نظریں جمائے ہوئے تھی تاکہ وہ اپنا کام پورا توجہ سے کریں۔ اچھے، پُرستائش اور نامکمل خامی ہونے کی صورت میں سرزنش بھی کرتی جا رہی تھی۔

مسلسل ۶ وزٹ کرنے کے بعد نور درخشاں دوبارہ پہلے وزٹ پر آ چکی تھی جہاں میڈم آسیہ سے اس کی ملاقات ہوئی جو کہ چھ ماہ سے کام چھوڑ چکی تھی اور آج دوبارہ میڈم آسیہ کو دیکھ کر نور خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

''کیسی ہیں آپ میڈم؟ نور نے میڈم آسیہ کو گلے لگاتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔''

ہاں نور میں بالکل ٹھیک لیکن تم مجھے قدرے کمزور دکھائی دے رہی ہو۔ کیا ہوا؟

لگتا ہے تم فیکٹری میں اپنی ساری قوت لگا رہی ہو اور مجھے نظر بھی آ رہا ہے میں یہاں تین گھنٹے سے ہوں اور ہمیں خبر آ رہی ہے۔

بریک کا وقت تھا اور نور نے میڈم آسیہ، جو کہ عیسائیت سے تعلق رکھتی تھی اُن کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا اور پھر کھانے کے بعد دونوں باتیں کرنے لگیں۔

''میڈم آپ آج؟''نور رُک کر بولی۔

''میرا مطلب ہے......''

''جی جی''......میڈم آسیہ بہت باتونی تھی کہنے لگیں بھئی دیوتا کمار صاحب کی کال آئی تھی آپ کو تو پتہ ہے اُن کو کووڈ پوزیٹو ہے۔''

''جی ہمیں پتہ چلا ہے فیکٹری میں اجتماعی دُعا بھی کروائی گئی آج اُن کی صحت کے لیے۔''

''جی تو اس سلسلے میں سر نے مجھے واپس ڈیوٹی پر آنے کا کہا ہے کیوں کہ ان کو لگتا ہے کہ اُن کی غیر موجودگی میں سٹاف کو متحرک رکھنا ضروری ہے۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔''

میڈم آسیہ نے یہ بتایا کہ''نور آپ کی صحت کو لے کر کافی فکرمند ہیں۔ وہ بتا رہے تھے آپ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں آپ کو زیادہ کام نہ کرنے دو مگر یہاں آ کر تو میں حیران ہوں کہ آپ کس قدر محنت کر رہی ہیں تو پھر تم کیسے بیمار نہیں پڑو گی۔''

نور ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''سر دیوتا کی شکرگزار ہوں کہ وہ میرے لیے اس قدر فکرمند ہیں۔ مگر مجھے اپنا کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ میں اپنا فرض سمجھ کر کرتی ہوں۔''

باب: 10

آج آٹھواں دن تھا دیوتا کو دیکھے ہوئے اور نور درخشاں آج فیکٹری میں سارا دن اپنے کام میں مصروف رہی مگر اس کے چہرے کی اُداسی تھکاوٹ کی وجہ سے نہیں یہ ظاہر تھا کہ وہ دیوتا کی کمی محسوس کر رہی ہے۔

کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ہمارے اردگرد رہنے والے افراد میں سے کوئی ایک ہمارے اتنے قریب ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کو آپ کے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔آپ کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے اور آپ خود کو دنیا کی سب سے بہترین شخصیت تصور کرنے لگتے ہیں۔یہی وہ فرد ہوتا ہے جو آپ کو آپ کی عزت کرنا سکھاتا ہے۔خود سے محبت کرنا سکھاتا ہے اور آپ کو معتبر تصور کرنے لگتے ہیں۔ایسے میں اگر وہ شخص ایک پل کے لیے بھی اوجھل ہو جائے تو آپ کو ساری دنیا خالی خالی سی لگتی ہے۔یہی سب کچھ نور کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

آسیہ اب قدرے بے تکلف ہو چکی تھی نور سے اور نور بھی اس کو اپنی بہترین دوست تصور کرنے لگی تھی دیوتا نے اُس کو نور کی مدد کے لیے خاص طور پر فیکٹری میں بھیجا تھا۔

لنچ بریک تھی۔آسیہ نے نوٹ کیا کہ نور آج سارا دن سے اُداس اور چپ چپ سی تھی۔پھر آسیہ نے پوچھ ہی لیا کہ ''نور کیا وجہ ہے جو اس طرح چپ ہو اور میں نے دیکھا تم نے ٹھیک سے کچھ بھی نہیں کھایا۔یہ اچھی بات نہیں ہے جس طرح تم کام کرتی اسی طرح مشقت کرتی ہو۔تو تمہیں انرجی کی ضرورت ہے اپنا خیال رکھا کرو۔''

نور نے کہا۔

''جی آسیہ باجی میں ٹھیک ہوں یار تم ایسے ہی میری فکر کر رہی ہو میں تو بس سر دیوتا کی وجہ سے پریشان ہوں وہ اکیلے ہوتے ہیں شاید؟''

نور جیسے دیوتا کی وجہ سے پریشان تھی اور یہ جاننا ضروری سمجھتی تھی کہ اس کا کوئی خیال رکھنے والا ہے یا نہیں آسیہ نے حیران کن آنکھوں سے نور کو بغور دیکھا اور کہا:

''جانم فکر نہیں کرو اُن کا ایک وفادار ملازم خان بابا اُن کا دل و جان سے خیال رکھ رہا ہے۔ اُن کی فیملی تو سری لنکا ہوتی ہے۔''

''جی مجھے پتہ ہے'' نور نے چائے کا گھونٹ بمشکل گلے سے اُتارتے ہوئے کہا۔

''تم کال کیوں نہیں کر لیتی سر دیوتا کو اُن کا حال پوچھنے کے لیے۔'' آسیہ کے اچانک مشورے پر نور نے چونک کر آسیہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا'' آسیہ نے لاپرواہی سے سینڈوچ کو چھری کانٹے سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''بھئی کال کر کے حال پوچھ لو۔ کچھ نہیں ہوتا کیوں اتنا سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کر رہی ہو کہہ جو رہی ہوں۔''

نور درخشاں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر حسبِ عادت رُک رُک کر بولی۔۔۔۔

''آج کروں گی گھر جا کر۔''

شام پانچ بجے کا وقت تھا اور فروری کا آخری ہفتہ تھا۔ سردی میں خاصی حد تک کمی آ چکی تھی جب نور گھر جانے کے لیے فیکٹری سے نکلی تو حیران تھی فیکٹری کے ہر پورشن سے گزرتے ہوئے اسے صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے پوسٹر دکھائی دے رہے تھے۔ اُسے مزید حیرت ہوئی جب اُس نے فیکٹری کے افتتاحی بورڈ جو کہ فیکٹری Dex کے آنر کے نام کی بڑی تختی کی جگہ بھی نبی کریم کے نام اور میلاد کی خوشی میں پوسٹر لگے دیکھے۔

غرض کہ فیکٹری، فیکٹری کم کسی محفل میلاد کا صدر مقام زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔

اتنے زیادہ پوسٹر دیکھ کر نور حیران تو تھی ہی مگر یہ سوچ کر پریشان تھی کہ فیکٹری کے اندر میلاد منانا تو ٹھیک ہے۔مگر فیکٹری وہ جگہ ہے جہاں لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق اپنا حلال رزق کمانے آتے ہیں اور اس میں کسی ایک مذہب سے ہی نہیں بلکہ مختلف مذہب سے لوگ تعلق رکھتے ہیں اُنکے جزبات کیا ہوں گے۔

نور کو کچھ ایسی ہی حیرت شہادت نامہ پڑھتے ہوئے ہی ہوئی جسکے آخری ۱۰۰ اصفحات قرآنی وظائف پر مبنی تھے اور نعرے مذہب کے قاری کو تنہا ہی تو کر دیتے تھے۔

خیر اِن سب سے زیادہ نور اس کا حکم جاری کرنے والے شخص کو جاننے کے لیے بے تاب تھی مگر اب آف ٹائم تھا چنانچہ اس نے گھر کی راہ لینے میں غنیمت سمجھی۔

وہ دیوتا کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اسے لگتا تھا کہ اسے مکمل صحت یاب ہونے کی ضرورت ہے جس کے لیے اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر نمازِ تہجد میں اس کی زندگی اور صحت یابی کے لیے دُعا کی وہ اس کو کیسے پریشان کر سکتی تھی۔

''اور مس نور آپ سنائیں اپنی صحت کا خیال رکھ رہی ہیں؟''

دیوتا نے اپنی طرف سے توجہ ہٹائی۔

''جی سر آپ نے مس آسیہ کو جو بھیج دیا میرا خیال رکھنے کے لیے وہ ہر وقت مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتی رہتی ہیں۔'' نور مسکرائی۔

دیوتا بھی مسکرا کر کہنے لگا ''تو اچھی بات ہے میڈم آسیہ نے بتایا آپ بہت دل جمعی سے کام کر رہی ہیں میری غیر موجودگی میں جس پر میں آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔''

شکریہ سر۔

پھر دیوتا اور نور آدھا گھنٹہ یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر نور درخشاں نے خود ہی کہا ''سر اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔''

''جی مس نور آپ بھی اپنا خیال رکھیے خدا حافظ۔''

دیوتا نے فون بند کئے بغیر ہی فون لیٹے ہوئے اپنے سینے پر رکھ دیا اور دوسری طرف نور دیوتا کی دل کی دھڑکن نا جانے کتنی دیر سنتی رہی اور پھر پورے 31 منٹ کے بعد دیوتا میڈیسن کے اثر سے دوبارہ جاگا تو اس نے اپنا فون ٹائم چیک کرنے کے لیے سکرین پر دیکھا تو دوسری طرف کال ابھی بھی جاری تھی۔

پھر دیوتا کو کھانسی آئی اور نور ڈرتے ہوئے فون بند کر گئی اور دوسری طرف دیوتا موبائل سکرین پر کال اینڈ کے اوپر نور کے نام کے Spellings گن رہا تھا اور پھر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر نور پر شاعری کا نزول شروع ہو گیا۔

میں جب سے تیری محبت کے سائبان میں ہوں

مجھے خدا کی قسم ہے میں اطمینان میں ہوں

مرا یقین تیرے پیار کی علامت ہے

میں اس یقین کے محفوظ سائبان میں ہوں

ابھی تلک کسی لغزش کا باقی ہے امکاں

ابھی تلک میں محبت کے امتحان میں ہوں

کہانی بکھری ہوئی ہے میرے صحیفوں میں

میں ہر کتاب کے ہی مرکزی بیان میں ہوں

مجید مجھ کو ابھی گھونسلے سے کیا مطلب

ابھی تو اپنے تخیل کی اُڑان میں ہوں

باب: 11

نور کے علاوہ فیکٹری کا ہر فرد حیران تھا فیکٹری کے اندر جگہ جگہ پوسٹر لگنے پر مگر کوئی بھی نہیں جان پار ہا تھا کہ یہ کس نے لگائے ہیں۔

پھر آسیہ نے نور کو بتایا کہ ''یہ حامد گجر اور رحمان سیال نے لگائے ہیں فیکٹری آنر سے اجازت لے کر۔'' ''مگر مجھے نہیں لگتا کہ فیکٹری آنر نے اس طرح سے اپنی تختی پر بھی پوسٹر لگاوانے کی اجازت دی ہوگی؟''

نور نے کہا۔

''بھئی ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے یہ حامد اور رحمان کسی مقصد کے تحت ہی یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔''

''کیا مقصد ہو سکتا ہے؟'' نور نے تشویش سے پوچھا

''میں اس بارے میں زیادہ بات تو نہیں کر سکتی مگر مجھے ان دونو ں کے پہلے کارناموں کا علم ہے کہ کس طرح اِن دونوں نے فیکٹری کے بیرون ملک جانے والی اہم پروڈکس میں گھپلا کیا اب ان جیسے لوگوں سے اچھے کی امید لگانا بے وقوفی ہی ہو سکتی ہے۔

نو یہ سب سن کر سوچوں میں گم ہو گئی۔

فیکٹری سے باہر آتے ہوئے آسیہ نے نور کو کہا کہ ''آج دیوتا کمار کو تیرواں دن ہے قرنطینہ ہوئے ہوئے۔ میں ان کی طرف جا رہی ہوں کیا تم بھی چلو گی؟'' نور نے کچھ سوچا اور کہا: ''کتنی دیر لگے گی'' ''بھئی پریشان نا ہوں میری گاڑی ہے نا میں خود اتار کر آؤں گی تمہیں گھر۔''

''او کے ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔''نور نے رضامندی ظاہر کی اور ٹھیک ۳۵ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد نور اور آسیہ دیوتا کے گھر کے باہر تھیں۔

آسیہ نے گاڑی پارک کی اور دروازہ پر بیل دی تو خاں بابا باہر آئے''اوہ میری بیٹی آسیہ''

''بچے کیسے ہو تم ؟''

''اتنی دیر کیوں لگایا؟''خان بابا آسیہ کو بہت اچھی طرح جانتے تھے پہلے تو پھر بھی آ جاتی ہوتی تھی''اب آسیہ۔کہاں گم رہتا؟''

خان بابا نے دروازے پر سوال کر دیئے

''خان بابا اندر تو آنے دیں سب بتاتی ہوں''

''جی جی میرے بچے آ جاؤ''

نور کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے خاں بابا نے آسیہ کی طرف دیکھ کر پوچھا''یہ کون تمہارا بیٹی ہے؟''

''آسیہ نے کہا: بیٹی ہی سمجھیں خان بابا''''بہت پیارا ہے ماشاءاللہ چیتا بچہ''

خان بابا نے اندر آ کر ڈرائنگ روم میں دونوں کو بٹھایا اور آسیہ نے پوچھا

''خان بابا میرے چھوٹے بھائی کا سنائیں کیسا ہے وہ اب؟''

نور آسیہ کی دیوتا کے اس قدر پاکیزہ محبت اور احترام دیکھ کر حیران تھی۔اس کے ساتھ خان بابا کا رویہ اور محبت،شفقت نور آسیہ پر رشک کرنے لگی۔

''جی تمہارا بھائی اب بہت بہتر ہے اور ڈاکٹر نے تو اسے دو دن بعد ڈیوٹی پر واپس جانے کی بھی اجازت دے دیا۔''

اور پھر دیوتا کمار کو بتانے اس کے روم میں چلا گیا

نور چاروں جہت ڈرائنگ روم کی بناوٹ دیکھ رہی تھی اور دیوتا کی کوئی نشانی

ڈھونڈ رہی تھی۔

مگر سارا گھر ہمارے گھروں کی طرح ہی سجایا گیا تھا۔

ہال کے بیرونی کمرے سے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔تھوڑی دیر بعد نور نے دیوتا کو آتے ہوئے دیکھا جو پہلے سے قدرے کمزور لگ رہا تھا۔

آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

Sleeping dress میں دیوتا ڈرائنگ روم میں ہال کی طرف کھلنے والے دروازے کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ گیا۔

جہاں سے تمام بیٹھے ہوئے لوگ باآسانی نظر آرہے تھے نور جس جگہ بیٹھی تھی وہاں ہال اور ڈرائنگ روم کے درمیان لگے پردے کی اوٹ میں تھی اور کبھی کبھی ڈرائنگ روم کی گیراج کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے ہوا آتی اور پردہ ہٹ جاتا یوں نور دیوتا کو دیکھ سکتی تھی۔

دیوتا وہی بیٹھا ہوا ماسک لگائے آسیہ سے حال احوال پوچھتا رہا اور آسیہ بھی اس کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح خوراک پر خاص دھیان دینے اپنی صحت کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کرتی رہی۔

پھر خان بابا چائے لے کر آ گئے۔

اور سب چائے پیتے ہوئے باتوں میں مشغول ہو گئے نور مسلسل دیوتا کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی مگر ہوا نے بھی نہ چلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

چنانچہ آسیہ کبھی کبھی نور کو بات میں شامل کر لیتی تھی جس پر نور اپنا حصہ گفتگو میں ادا کرنے میں کامیاب ہوتی رہی۔

پھر فیکٹری کے موضوع پر کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ دیوتا نے آسیہ سے چند فائیل منگوائی تھیں وہ ان کو چیک کرنے لگا اور پھر ایسا ہوا کہ گفتگو صرف آسیہ اور دیوتا کے

درمیان ہوکر رہ گئی۔

نور کو اپنی ذات نظرانداز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی وہ ڈرائنگ روم سے باہر کھلنے والے دروازے کو دیکھنے لگی اور پھر اچانک سے اُٹھ کر صحن میں چلی گئی۔ سفید رنگ کے گلاب نور کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہے تھے اور پھر اس نے اپنے کندھے سے لٹکے ہوئے موبائیل فون کو نکالا اور سفید گلاب کی تصویریں بنانے لگی۔

خان بابا نور کی سرگرمی دیکھ رہے تھے اور پھر گویا ہوئے:

''بچے اس کا بڑا دیکھ بھال کرتے ہیں ہم......''

''بالکل اپنے بچوں جیسا''

بڑی کالی چادر میں نور بھی کسی گلاب کی مانند دیکھائی دے رہی تھی خان بابا کی باتوں پر مڑی اور دیکھا کہ خان بابا اُسے پودے کے بارے میں بتا رہے تھے۔

''بیٹا تمہیں بھی شوق ہے پودے پالنے کا؟''

خان بابا نے نور سے پوچھا۔

نور نے ایک پیلے رنگ کے گلاب کی پنکھڑیاں محسوس کرتے ہوئے کہا:

''جی خان بابا''

''میری بی اماں نے گھر میں بہت سے پودے لگا رکھے ہیں جو کہ میرے بہترین دوست بن گئے ہیں میں روز صبح نماز فجر کے بعد اُن کو دیکھنے صحن میں چلی جاتی ہوں۔ اُن سے باتیں کرتی ہوں مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔''

''ارے واہ! آپ تو میرے دیوتا بیٹے جیسی ہو'' خان بابا نے بلاسوچے سمجھے نور کو دیوتا کمار سے ملایا تو نور کا دل ڈیزی کے ننھے پھول کی طرح جھوم اُٹھا جو ہلکی سی ہوا پر بھی رقص کرنے لگتا ہے۔

''اچھا دیوتا سر کو سفید اور پیلے پھول پسند ہیں کیا؟''

''جی بیٹا یہ اُن کی خصوصی ہدایت پر لگائے گئے ہیں اُن کی دیکھ بھال کاٹ چھانٹ میں وہ کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔''

خان بابا نے نور پر دیوتا کا ایک شوق افشاں کیا تو نور دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور خود سے کہہ رہی تھی:

کیسا حسین اتفاق ہے ان سفید اور پیلے گلابوں کا۔ پھر وہ لان میں پڑی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی جہاں پر دوسری کرسی پر خان بابا بیٹھے تھے۔ جیسے وہ مزید جاننا چاہتی ہو دیوتا کے بارے میں۔

''آپ کب سے یہاں کام کر رہے بابا؟''

''بچے میں سات سال پہلے اپنے گاؤں سے شہر کو آیا تھا کام کی تلاش میں دو دن تو پہلے شہر میں آ کر سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں بھیک مانگنا میرا شیوہ نہیں۔ چنانچہ چند دن مسواکیں بیچ کر گزارہ کرتا رہا۔

پھر ایک دن ایک آدمی کی گاڑی میرے پاس آ کر رکی اس نے مجھے ہزار کا نوٹ دیا مگر میری مسواکیں نہیں خریدیں میں نے کوشش بھی کی مگر وہ گاڑی تیزی سے دوڑاتا ہوا نکل گیا۔

''یہ آدمی ہر ہفتے کو، جس روڈ پر میں صرف ہفتہ کے دن کھڑا ہوتا تھا، مجھے ہزار روپے دے کر جانے لگا۔ میں لاکھ کوشش کرتا مگر اس نے مجھ سے مسواک نہیں خریدی۔ میں نے بھی کہا کہ چلو بھئی اللہ کا دیا مل رہا ہے۔ شکر کیا مگر پھر میرے اندر کے ضمیر نے مجھے پھر سے جگایا کہ ایسے تو میں بھکاری بن جاؤں گا۔

''چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب کی بار وہ آدمی آئے گا تو میں اس سے ہزار روپے تب تک نہیں لوں گا جب تک وہ میری مسواکیں نہ خرید لے۔''

اور پھر وہ آدمی نظر آیا بڑی گاڑی میرے قریب آ کر رُکی اور مجھے ہزار کا نوٹ

دیا۔

''مگر میں نے بھی تہیہ کرلیا تھا میں نے وہ نوٹ گاڑی میں واپس پھینکا اور اُس آدمی کو غصے سے کہا ''میں بھکاری نہیں ہوں میرے بیٹوں نے مجھے گھر سے نکال دیا مگر میرے اللہ کا دَر کھلا ہوا ہے میں اس کے در کے علاوہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا'' وہ آدمی میری باتیں پُرنم آنکھوں سے سُن رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی سے نیچا اترا اور مجھ سے معذرت کی کہ اس کا ہرگز مطلب میری دل آزاری کرنا نہیں تھا بلکہ وہ تو اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔''

''پھر اس نے مجھے کہا کہ میں بھی آپ کے بیٹوں کی طرح ہوں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنے گھر لے جا سکتا ہوں پھر وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔

اب یہی میرا گھر ہے اور دیوتا میرا بیٹا''

''دیوتا سر؟''

نور نے حیرانگی سے پوچھا

خان بابا نے مسکرا کر کہا

''ہاں میرے بچے یہ نام کا ہی دیوتا نہیں بلکہ اس انسان کے ہاتھ اللہ نے بہت سارے لوگوں کا رزق لکھ دیا ہے۔ میرے علاوہ بھی یہ بارہ اور غریب بوڑھے مردوں اور عورتوں کے گھر کی کفالت کرتا ہے جو ہر مہینے اس کے دروازے پر آ جاتے ہیں اس انسان کو اللہ نے بڑی عزت بخشی ہے ورنہ بہت سے مسلمان بھی ایسے ہیں جو اپنے مسلمان بھائی کے منہ سے نوالا تک چھین لیتے ہیں۔''

خان بابا نے قدرے تفصیل سے دیوتا کی خوبیوں کو گنوایا تو نور کو اپنے انتخاب محبت پر جیسے فخر محسوس ہونے لگا اور پھر اُس کی بھوری آنکھیں جو دراز پلکوں کے بوجھ سے بند ہو رہی تھیں سورج کی روشنی میں اُن میں جھیل جیسا پانی چمکنے لگا۔

نور کو ایک دم کھانسی ہوئی تو خان بابا جلدی سے اُٹھ کر پانی لینے چلے گئے جب

تک خان بابا لوٹے نور کی کھانسی رُک چکی تھی۔ پھر بھی اُس نے پانی کے دوگھونٹ لے کر گلاس واپس سامنے بنی خوبصورت میز پر رکھ دیا۔

''بچے پانی تو پورا ختم کرو ایسے نہیں کرتے پانی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔'' خان بابا نے نور کوٹو کا۔

''جی خان بابا نور نے دوبارہ پانی کا گلاس ہاتھ میں لیا مگر پیا نہیں۔''

''بیٹے پانی تو آج کے دور میں سہولت سے مل رہا ایک وقت ہمارا تھا کہ پانی پینے کے لیے صرف کنویں ہوتے تھے اور اس سے پانی نکالنا اور پھر گھر لے کر آنا تا کہ بچے صاف ستھرا پانی پی سکیں۔''

نور نے کہا'' خان بابا مزید بتائیں کنویں سے پانی نکالنے کا عمل کیا تھا مجھے یہ سب قدیم دور کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا ہے۔''

نور نے اپنے چہرے کے نیچے تھوڑی پر ہاتھ رکھے اشتیاق سے کہا۔

خان بابا شروع ہو گئے:

''بیٹا کنواں جس کو گاؤں میں سب ''کھوہی'' کہتے تھے اُس کے اوپر اُبھرے ہوئے کنارے کو'' موین'' کہتے تھے جیسے مکانوں کے اوپر منڈیر بنائے جاتے ہیں بالکل ایسے ہی چاروں طرف سے کنواں ان سے گھیرا ہوتا تھا۔

اس کے اوپر جانے سے پہلے لوگ اجوتے پیچھے اتار کر پاؤں دھو کر اوپر جاتے تھے۔

لیول تھوڑا اونچا ہوتا تھا اسی کنارے کے اوپر ایک پونی جس کو چرخی بھی کہتے ہیں وہ لگی ہوتی تھی جو کہ گول گول گھومتی تھی۔

اسی کے ایک رسی لگی ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ربڑ کی طرح کا ڈھول ہوتا تھا جس کو پانی کے اندر ڈالتے تھے۔'' ''خان بابا یہ چرخی کیا تھی؟''

''چرخی بیٹا پہلے لکڑی کی ہوتی پھر آہستہ آہستہ لوہے کی آنے لگی اس کے اوپر رسی لپٹی ہوتی تھی جس کو کہتے تھے پوڑی۔ یہ رسی اسی طرح کی بنی ہوتی تھی۔

اور جو ڈوری بندھی ہوتی ہے ڈھول کے ساتھ یا بوکے کے ساتھ چرخی کے اوپر دستیاں سی لگی ہوتی تھیں۔ جن کو مٹھّیاں بھی کہتے ہوتے تھے۔

پھران کو بار بار کھینچتے تھے۔ پھر رسی اوپر لپٹتی جاتی تھی۔ پھر بوکا پانی کا بھر کر باہر آجاتا تھا۔''

''واہ خان بابا یہ تو بڑی محنت کا کام ہوتا تھا۔''

نور نے حیرانگی سے کہا

خان بابا مسکرانے لگے۔ ''ہاں بچے تم آج کل کا بچہ ہے تم لوگوں کو کیا پتہ تم لوگ تو بس ٹوٹی کھولی پانی بھرا اور پی لیا بڑی محنت کی ہے اپنی جوانی میں ہم نے۔ میرے ابا اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت میں جگہ دے۔ خاندان کے لیے الگ سے کنواں بنوا گئے جہاں سے لوگ پانی پیتے اور ان کو دُعائیں دیتے تھے۔''

نور دیوتا اور آسیہ کو ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑے ہاتھ میں وہی فائلیں پکڑی دیکھا اُن کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ معاملہ تشویش ناک ہے۔

کبھی کبھی دیوتا باغیچے میں بیٹھی نور پر سرسری نظر ڈال کر پھر اپنا سر فائیل پر جھکا دیتا اور نور اُسی ایک نظر کے حصار میں کھوئی رہتی۔

خان بابا اُٹھ کر رات کا کھانا بنانے چلے گئے تو نور پھر سے پھولوں کی دنیا میں کھو گئی وہ ہر ہر پھول کو قریب سے دیکھ رہی تھی اور لاعلم تھی کہ دیوتا اُس کو بغور دیکھ رہا تھا۔

نور پھولوں کے درمیان کسی سفید پھول کی مانند دکھائی دے رہی تھی اور دیوتا کو اس کے حسین ہاتھوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے گلاب کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔

مگر دیوتا کا دماغ کسی صورت بھی اس کے دل کی حالت کو قبول کرنے پر راضی

نہیں تھا۔

آسیہ اور دیوتا دونوں قدرے فاصلے پر چلتے ہوئے باغیچے میں جہاں نور پھولوں کی کہکشاں میں کھوئی ہوئی وہاں آن پہنچے نور ابھی تک لاعلم تھی۔

آسیہ کی اچانک آواز پر نور مڑی تو اس کی چادر سے اُس کے سنہری بال بھی زبردستی باہر آنے لگے۔

اُس نے جلدی سے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا۔

''جانا نہیں نور میری پیاری؟ کیا پھولوں کے درمیان سونے کا ارادہ ہے؟'' آسیہ نے کہا۔

نور مسکرادی ''چلیں جناب ہم تو آپ کا انتظار فرما رہے تھے۔''

پتہ نہیں کیوں نور دیوتا کی موجودگی میں اور بھی زیادہ خوبصورت لگنے لگتی تھی۔

اُس کی نظروں نے کیا سے کیا بنادیا
ورنہ کمال کیا تھا میرے حُسن میں

دیوتا پھر قدرے فاصلے پر کھڑے ہو کر دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس کے نقاہت بھرے چہرے کی تھکاوٹ دور کر رہی تھی۔

''اچھا بھائی اپنا خیال رکھئے گا اور انشاء اللہ سوموار کو آپ سے ملتے ہیں'' آسیہ نے زنانہ انداز میں نکلتے نکلتے کہا۔

نور نے بھی اپنی نظروں سے سب کچھ کہہ دیا جو دیوتا محسوس کر سکتا تھا مگر جان بوجھ کر انجان بننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

رستے میں جاتے ہوئے آسیہ نور کو بتا رہی تھی کہ ''میں نے جب دیوتا کو حامد اور رحمان کی خطرناک سرگرمیوں کا بتایا تو میں حیران تھی کیونکہ اکرم سب حالات دیوتا کو پہلے سے ہی آگاہ کر چکا تھا۔''

باب: 12

ٹینا کا معمول تھا دیوتا کی بیماری کے دوران معمول سے ہٹ کر دن میں ہر ایک گھنٹہ بعد اس کا حال دریافت کرنا۔اس سے کھانے کی ساری تفصیل پوچھنا اور ساتھ ہی ساتھ دوائی وقت پر لینے کی ہدایت کرنا۔ٹینا دور رہ کر بھی اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی۔

دیوتا کے بار ہا بتانے پر بھی کہ وہ اب ٹھیک ہے ٹینا کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھی۔وہ اس سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں رو رو کر اس کی صحت یابی کے لیے دُعا گو تھی۔بُدھ اُس کے سر پر سایہ شفقت رکھیں۔دیوتا بھی بخوبی جانتا تھا کہ ٹینا کی اس سے محبت لازوال ہے۔وہ اُسے ہر صورت مُسکراتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔آج راون نے دیوتا سے بات کرتے ہوئے بتا دیا کہ پاپا ماما سارا دن رو رو کر آپ کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہیں۔راون تو یہ بات شرارتی انداز میں کر گیا مگر دیوتا کا دل پگھل کر موم ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلا۔اس نے جب ٹینا سے پوچھا تو ٹینا بات کو ٹال گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ دیوتا کو پتہ چلے کہ اس کی وجہ سے روتی ہوں مگر دیوتا تو دیوتا تھا اس نے سب محسوس کر لیا۔

بعض دفعہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں وہ ہماری اَن کہی باتوں کو بھی زبان دے دیتے تھے۔اُن کو ہمارے دل کی حالت بھی معلوم ہوتی ہے اور یہی تو روح کے رشتے ہوتے ہیں۔ٹینا دیوتا کی باتیں سن رہی تھی اور اس کا دل محبت سے لبریز تھا کہ اسے اس جیسے شخص کا ساتھ ملا جو اس سے اس قدر محبت کرتا ہے۔یہ اتوار کا دن تھا اس سے اگلے دن دیوتا نے پندرہ دن کی چھٹیوں کے بعد فیکٹری دوبارہ جانا تھا۔اب اُس کی حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی۔اس دن ٹینا سے کال معمول سے کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔

دیوتا اُسے بار بار راون اور کشور کی پڑھائی پر خاص توجہ دینے کے بارے میں

باتیں کرتا رہا۔ پھر دونوں اس بات پر بحث کرتے رہے کہ راون کو آرمی میں بھیجنا ہے یا نہیں؟ پھر بات یہاں ختم ہوئی کہ راون پاکستان آ کر پاکستان کی آرمی کو جوائن کرے گا کیونکہ دیوتا پاکستانی آرمی کی طاقت جوش و جذبہ سے بے حد متاثر تھا جس طرح پاکستانی آرمی نے بہت جلد دنیا میں ایک الگ مقام بنایا تھا۔ دیوتا کا اس سے متاثر ہونا فطری سی بات تھی۔ چنانچہ دیوتا راون کو پاکستان آرمی میں بھیجنے کا سوچ رہا تھا مگر ابھی تو وہ بہت چھوٹا تھا مگر والدین تو ایسے ہی کرتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے خواب ان سے پہلے ہی دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ان کے اندر وہ جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے دنیا اُن کی تعریف کرے۔

یہ والدین اور استاد ہی ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو خود سے آگے جاتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ۔ ورنہ دنیا میں اور ایسا کوئی بھی نہیں ہوتا جو آپ کو اپنے آپ سے آگے جاتا دیکھے اور خوش ہو۔

دیوتا کی ماں آ گئی فون پر جو خاصی دیر تک اپنے بیٹے سے اُس کا حال احوال پوچھتی رہی اور پھر یہ محبت بھری آواز دیوتا کی سماعتوں میں رس گھولتی رہی۔

دیوتا ویڈیو کال سے بات کرر ہا تھا تو اُس کے بوڑھے والد اپنے ہاتھ کے اشارے سے دیوتا کو اپنی دُعائیں اور محبت نچھاور کر رہے تھے۔ آج دیوتا کی کال معمول سے زیادہ ہی لمبی ہوگئی۔ مگر وہ بہت خوش تھا۔

نور اپنی کاپی اور پنسل لیے باغ میں آ گئی تھی جہاں بی اماں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔ خاصی دیر نور اپنے پرندوں کو دانا ڈالتی رہی اور اُن سے باتیں کرتی رہی۔ پھر درخت کے ساتھ لگے جھولے میں بیٹھ گئی اور اپنے رجسٹر پر پروین شاکر کی ایک نظم نقل کرنے لگی۔

وہ صورت آشنا میرا

میں اُس کے سامنے
چپ رہ کے بھی یوں بات کرتی ہوں
کہ آنکھوں کا کوئی حرف بدن نا آشنا
آلودہ پیکر نہیں ہوتا
خواہ موسم پہ صدا اظہار ہو
یا ٹیلی ویژن پر
وہ میرے لمحہ موجود کا دُکھ جان لیتا ہے
مجھے پہچان لیتا ہے
مری ہر بات کا چہرہ نہ چھو کر دیکھنے پر بھی
وہ صورت آشنا میرا
مرے لہجوں کے پس منظر سمجھتا ہے!

''کیا لکھتی رہتی ہے نور میری چندا؟''بی اماں نے نور کے جھولے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

نور دبی ہوئی مسکراہٹ کے حصار میں آ گئی ''کچھ نہیں بی اماں ایسے ہی۔

امی کہاں ہیں؟''

نور نے موضوع بدلا۔

''وہ تیری خالہ زیبا بیمار ہے کافی دن سے تو اس کو دیکھنے گئی ہوئی ہے آ جاتی ہے بلکہ آنے ہی والی ہوگی۔''

نور کو شرارت سوجھی۔ پیچھے سے سانپ کی طرح ایک رسی پکڑ کر زور زور سے چلائی

''بی اماں بی اماں سانپ سانپ۔۔۔۔۔''

بی اماں نے اپنا جوتا اُتارااور پھرنور آ گے آ گےاور بی اماں پیچھے پیچھے

کافی دیر تک یہ چھپن چھپائی چلتی رہی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی دونوں کو خیال آیا ہمسایوں تک آواز نہ چلی جائے۔

باہر فرخندہ تھی نور کی ماں

بی اماں اب مرچ مصالہ لگا لگا کر فرخندہ کو نور کی اس سے کی جانے والی شرارت کے احوال سنا رہی تھی۔نور لاکھ اپنی صفائیاں دے رہی تھی مگر فرخندہ بی اماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی چنانچہ جھوٹی موٹی ہی سہی فرخندہ نے نور کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔

نور بھی اپنی ماں کی ڈانٹ کے پیچھے چھپے پیار کو محسوس کر رہی تھی اور دبی ہوئی ہنسی میں بی اماں کو دیکھ رہی تھی جس کا دوڑنے کے بعد خاصہ سانس پھولا ہوا تھا۔ پھر فرخندہ نے نور کو بی اماں کے لیے پانی لینے بھیجا پانی پینے کے بعد بی اماں کا غصہ ٹھنڈا ہوا پھر نور کا سر بی اماں کی گود میں اور بی اماں بھی سب کچھ بھول کر اس کے سنہری بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

فرخندہ دونوں کو پھر سے اکٹھا دیکھ کر مسکراتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

بی اماں کی گود میں باتیں کرتے آسمان پر ستارے بھی ٹمٹمانے لگے اور بھی جلوہ فروز ہوا۔

''بی اماں آپ نے کبھی نوٹ کیا ہے یہ چاند اور ستارے ایک ساتھ کتنے اچھے لگتے ہیں؟ پورے آسمان کو دیکھیں تو اور بھی بہت سارے ستارے ہیں مگر ہماری توجہ کا مرکز صرف یہ تین ستارے ہیں جو کہ چاند کے اردگرد ہیں۔''

''پتہ ہے یہ کیوں ہیں؟''

''ہاں میری چندا اب تم ہی بتادو'' بی اماں مسلسل نور کے بالوں کو سہلا رہی تھی جس سے نور نیند میں غوطے لے لے کر بات کر رہی تھی۔

اب خاموش کیوں ہوگئی۔ بی اماں نے نور کو اس کی بات پر جاری رکھنے کو کہا۔

''اصل میں نا بی اماں وہ سارے ستارے آسمان پر موجود ہیں مگر یہ تین ستارے اس لیے ہماری نگاہوں کا مرکز ہیں کیونکہ چاند ان کی دلکشی کو بڑھا رہے ہیں اسی وجہ سے یہ ستارے ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔''

''مگر......''

نور اٹک کر رک رک کر گویا ہوئی

یہ چاند اس لیے خوبصورت نہیں لگ رہا کہ اس کے اردگرد یہ تین ستارے موجود ہیں بلکہ اگر یہ ستارے نہ بھی ہوتے تو چاند اکیلا بھی رات کو خوبصورت بنا دیتا۔

''ہاں مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ ستارے چاند کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث ہیں۔''

''ہاں میری چندا'' بی اماں نے کہا۔

''پر بی اماں کچھ لوگ بھی ایسے ہوتے ہیں نا بالکل چاند جیسے جو اپنی خوبصورتی اور انفرادیت میں الگ تھلگ ہوتے ہیں یہ ضرور ہے کہ یہ لوگ ان ستاروں یعنی دوسرے لوگوں کی وجہ سے کام کرتے ہیں ترقی کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ چاند جیسے ہوتے ہیں وہ اگر اکیلے بھی ہوں تو وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

اور پھر......

اتنا کہہ کر نور بات کرتے ہوئے سوگئی

تو اماں نے مسکرا کر نور کو دیکھا

اور پھر نور کے بالوں کو سہلاتے سہلاتے بی اماں چاند کو دیکھتے دیکھتے نور کی مشکل باتوں پر غور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

باب: 13

''دیوتا سر آ گئے ہیں!اکرم؟''

آسیہ نے دیوتا کے اسسٹینٹ کو پوچھا

''جی میڈم! دیوتا سر ماشاءاللہ آج آ گئے ہیں ڈیوٹی پر۔''

دیوتا سر کی غیر موجودگی میں فیکٹری پر بہت اثرات پڑے ہیں رحمان اور اس کے ساتھ مضبوطی سے سب فورمین اور لیبرز کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں۔ سب کو اُن کی حقیقت کا علم نہیں مگر ہم جانتے ہیں ان سب کے پیچھے اِن کے اپنے کالے کرتوت ہیں جن کو وہ چھپانے کی خاطر یہ سب کر رہے ہیں مگر دیوتا سر نے بھی ٹھان لی ہے وہ ان کو بے نقاب کر کے چھوڑے گا۔''

اکرم اپنی لاعلمی میں جب آسیہ سے یہ بات کر رہا تھا تو ایک لیبر نے اُن کی ساری باتیں سن لی تھیں اور اس نے جا کر رحمان کو ساری باتیں بتا دیں اور اب رحمان نے ٹھان لیا تھا کہ وہ دیوتا کو کسی طرح بھی اس فیکٹری سے نکال کر ہی دم لے گا۔

اُدھر دیوتا نے اکرم کو حکم دیا کہ مین بورڈ جس پر فیکٹری کا افتتاحی بورڈ لگا ہے وہاں سے دوسرے سارے بینرز ہٹا دیئے جائیں تاکہ فیکٹری کا وقار اور ایک امیج برقرار رہ سکے۔ اکرم نے دیوتا کے حکم کے مطابق کافی سارے بینرز اتار وا دیئے اور دیوتا کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے اُن اُتارے ہوئے بینرز کو باحفاظت فیکٹری کے سب سے اوپر والے روم میں بنے ہوئے ڈبوں میں رکھ دیا تاکہ مقدس الفاظ اور مقامات کی تصاویر کی بے حرمتی نہ ہو اور پھر فیکٹری میں رنگ وروغن کروا کر ساری فیکٹری کو صاف ستھرا کرنے کا حکم دیا۔ اکرم سارے کام مکمل کرنے کے بعد دیوتا کو سب تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ دیوتا اکرم پر بہت

بھروسہ کرتا تھا۔یہی وہ شخص تھا جو رحمان اور حامد کے سارے کاموں کی تفصیلات دیوتا کو بیماری کے دنوں میں چیدہ چیدہ پہنچا تا تھا کہ وہ کس طرح فیکٹری کی ساکھ کو نقصان پہنچا رہے ۔دوسرے ممالک میں ہمارا بنا ہوا سامان ڈبل قیمت پر فروخت کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ فیکٹری کی بھاری قیمتی مشینیں بھی انھوں نے دیوتا کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غائب کر دی۔دیوتا نے ہر کام کو ٹھیک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور رحمان اور حامد سمجھتے تھے کہ اُن کے برے دن شروع ہونے والے ہیں۔

فیکٹری کے مالکان دیوتا پر بہت اعتماد کرتے تھے کیونکہ اُس نے اُن کی غیر موجودگی میں ساری پروڈکشن اور سارے عملے جنرل منیجر،فورمین،سپروائزر حامد اور رحمان سمیت ہر فرد سے پوری ایمانداری سے کام لیا تھا اور کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی تھی۔

سارے حالات و واقعات پر رحمان اور حامد تشویش کا شکار تھے اُن کی ساری چوری پکڑی جا چکی تھی مگر وہ کسی صورت بھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔فیکٹری کا ٹائم ختم ہوتے ہی حامد اور رحمان نے اپنے ساتھ کچھ لیبرز کو لیا اور رحمان کے گھر روانہ ہو گئے وہاں رحمان کی بیٹھک میں رحمان اور حامد کے علاوہ کچھ اور لیبرز بھی موجود تھے۔رحمان نے سب کی پہلے خوب خاطر تواضع کی اور پھر آہستہ آہستہ سب کو ورغلایا کہ تم لوگوں نے دیکھا ہے دیوتا نے سارے پوسٹر جو کہ نبی کریمؐ کی شان میں لگے ہوئے تھے اُتار وا دیئے۔یہ تو سراسر ہمارے مذہب پر وار ہے۔رحمان اور حامد نے سب لیبرز کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے پچھلے دنوں میں جب دیوتا علیل تھا اُن سے بالکل کام نہیں لیا تھا۔جس کی وجہ سے سارے لیبر پہلے ہی بہت خوش تھے کہ دیوتا تو اُن سے بہت سخت کام لیتا ہے سوائے بریک کے سارا وقت کام پر لگائے رکھتا ہے۔رحمان اور حامد کسی حد تک لیبرز کا اعتماد جیت چکے تھے اور اُن کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھانے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ دیوتا ایک سخت اور ہمارے

مذہب سے نفرت کرنے والا انسان ہے۔

سامنے گیٹ سے نکلتے وقت آسیہ اور نور پر سرسری نظر ڈالتے جو سلائی کے ڈیپارٹمنٹ Departement سے آ رہی تھیں۔

آسیہ نے کہا ''نور وہ دیکھو دیوتا جا رہا ہے۔ چلو آؤ اُن کا حال پوچھ لیں'' نور کی بات کا جواب سنے بغیر ہی آسیہ گاڑی کی جانب بڑھی تو دیوتا جلدی سے گاڑی سے اتر کر آسیہ اور نور کے لیے اپنے جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

''کیسے ہیں؟ دیوتا کمار آپ'' آسیہ دیوتا کو فیکٹری میں اسی طرح احترام سے بلاتی تھی چاہے گھر میں وہ اسے چھوٹا بھائی سمجھ کر ڈانٹ بھی لیتی تھی مگر احترام اور عہدہ اپنی جگہ مقدم تھا ''جی میں بالکل ٹھیک ہوں'' نور خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہی تھی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک فائل پر اپنی انگلیوں سے کچھ لکھ لکھ کر مٹا رہی تھی۔

دیوتا نے اُسے کہا: ''مس نور کیسی ہیں آپ؟'' سوچوں سے واپس آتے ہوئے نور نے کہا ''جی سر میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''چلیں آئیں میں آپ دونوں کو چھوڑ دوں۔''

آسیہ نے کہا: ''نہیں سر میرے پاس گاڑی ہے۔ مگر نور کو آج اگر آپ چھوڑ دیں تو مہربانی ہوگی کیونکہ مجھے آج اپنی امی کی طرف جانا ہے اور راستہ بدلنا پڑے گا۔ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں کافی دنوں سے، میرا آج بہت دل ہے کہ میں اُن کو دیکھ آؤں بُرے بُرے خیالات آ رہے ہیں صبح سے ہی......''

''جی جی آپ جائیں نور اگر میرے ساتھ جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''نور نے کہا its okay sir میں cab سے چلی جاؤں گی آپ جائیں کوئی مسئلہ نہیں'' مگر آسیہ نے ضد کر کے نور کو دیوتا کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ نور کے ساتھ اپنی بہنوں کی طرح محبت کرنے لگی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نور اکیلی گھر جائے۔

سارا راستہ گزر چکا تھا مگر نور نے دیوتا سے کوئی بات نہیں کی اور نا ہی دیوتا نے نور سے۔ مگر خاموشی سے نور نے دیوتا سے کئی باتیں کہہ ڈالی تھیں۔ جو خاموشی کی زبان ہوتی ہے وہ بھی تو ایک زبان ہے اور اس کو وہی سن سکتے ہیں جو خاموشی کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ ''سر آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' نور نے خاموشی توڑی سامنے سکرین کو دیکھتے ہوئے دیوتا نے کہا ''جی بالکل نور'' پھر نور نے دیوتا سے پوچھا ''سر میں نے آپ کے گھر اُس دن شیلف میں قرآن پاک (انگلش ترجمہ) دیکھا تھا......اور پھر دیوتا نے مسکرا کر کہا ''جی وہ میں پڑھتا ہوں۔ خان بابا روز صبح صبح تلاوت کرتے ہیں تو میرا دل تلاوت سے معمور ہو جاتا ہے مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی مگر روح کو ایک سکون سا ملتا ہے بہت پُرسکون آواز میں خان بابا تلاوت کرتے ہیں۔ وہ میرے کمرے تک آواز آتی ہے اور پھر میں اکثر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور اس کو سنتا رہتا ہوں۔

بس اسی شوق کی خاطر میں نے قرآن پاک کا ترجمہ انگلش میں خریدا اور کبھی کبھار اس کو پڑھتا ہوں مجھے ویسے بھی اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے بارے میں جاننے کا شوق ہے کہ وہ انسان کیسے تھے؟ یہ سب باتیں مجھے قرآن سے پتہ چل رہی ہیں۔'' نور بہت حیرانگی سے دیوتا کی باتیں سنتی رہی پھر گھر آ گیا اور پھر نور گھر چلی گئی۔ مگر نور مسلسل دیوتا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیونکہ آج وہ شخص اُسے غیر یقینی حد تک حیران کر گیا تھا۔

نور نے وضو کیا اور قرآن پاک کھول لیا اور پھر اچانک اس کی نظر قرآن کی ان آیات پر پڑی۔

''اور پھر اللہ جسے چاہے ہدایت کے رستے پر ڈال دے''

نور کو ایک انمول خوشی نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ یہ سب جاننے کے بعد کہ دیوتا اسلام کو اگر جاننے کی کوشش میں لگ گئے ہیں وہ بہت جلد مسلمان ہونے والے ہیں۔

اور پھر وہ جائے نماز پر بیٹھی بیٹھی اس دعا کو پڑھنے لگی:

رب کونین میرے دل کی دعائیں سن لے
میں ہوں بے چین میرے دل کی صدائیں سن لے
شان اعلیٰ ہے تیری مالک ومختار ہے تو
مجھ کو معلوم ہے دنیا کا مددگار ہے تو
ہم ہیں محتاج ہمیں علم کی دولت دے دے
اپنے انمول خزانے سے انمعت دے دے
ہم ہیں کمزور ہمیں دولت ایماں دے دے
ناتواں بندے سے بھی دین کی خدمت لے لے
جلوہ حق سے ہمارے دل کو فروزاں کر دے
نور اسلام کا چہرے پہ نمایاں کر دے
ہم پریشاں ہیں سرمایہ راحت دے دے
اپنے محبوب کی سچی محبت دے دے
میرے محبوب! جسے کہہ کر بلایا تو نے
واسطہ اس کا گناہگاروں کی بخشش کر دے
اپنی اس بندہ ناداں پہ نوازش کر دے
نور اسلام چہرے پر منور کر دے
کونین میرے دل کی دعائیں سن لے
میں ہوں بے چین میرے دل کی صدائیں سن لے

اگلی صبح جب دیوتا اٹھا تو حسب معمول خان بابا ہال میں تلاوت قرآن پاک میں مشغول تھے اُن کی آواز سننے والے کی سماعتوں میں ایک کشش پیدا کر دیتی تھی اور دیوتا اپنے

سلیپنگ سوٹ میں ہی خان بابا کے پیچھے بیٹھ کر صوفے پر نہایت ادب سے سر جھکائے قرآن پاک سنتا رہا۔ خان بابا نے بھی تلاوت کو خوب طول دیا اور معمول سے ہٹ کر اپنا پارہ ختم کرنے کے بعد اگلے پارے کی جانب آ گئے۔ دیوتا خاموشی سے خان بابا کی تلاوت سنتا رہا۔

''یہ حق ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب کی طرف سے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں ڈرائیں۔ ایسی قوم کو جس کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل تا کہ وہ ہدایت پائیں۔ اللہ ہی وہ ہستی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا۔

اور کوئی نہیں ہے تمہارا اُس کے سوا نہ کوئی ولی اور نہ ہی کوئی سفارشی کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

وہی تدبیر کرتا ہے ہر امر کی آسمان سے لے کر زمین تک اور پھر یہ تمام امور اُسی کی جانب لوٹائے جاتے ہیں۔

ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ہزار سال کے برابر ہے۔ تمہارے شمارے کے مطابق وہی تو ہے جاننے والا ہر غیب اور ظاہر کا زبردست نہایت رحیم''

پھر خان بابا نے قرآن پاک کو کئی مرتبہ اپنے چہرے سے لگایا اور پھر قرآن پاک کو خوبصورت کور میں بند کر دیا اور جب خان بابا مڑے تو دیکھا دیوتا صوفے پر بیٹھا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ کسی گہری غور وفکر میں مشغول تھا۔ شاید وہ اللہ کی تلاش میں تھا یا پھر اُس نے اللہ کو پا لیا تھا؟

باب: 14

نور کے فون پر گھنٹی بجی تو دوسری طرف آسیہ تھی جو اپنی ماں کے انتقال کی خبر بڑے حوصلے سے نور کو سنا رہی تھی جس کی رات ہی کو تدفین کر دی گئی تھی۔ نور کے پاس افسوس کے الفاظ بھی کم پڑے رہے تھے کیونکہ دنیا کی کسی ڈکشنری کے اندر وہ الفاظ ہی نہیں جو ماں کے مر جانے پر دُکھ کا مداوا کر سکیں۔

پھر بھی نور نے آسیہ کو تسلی دی اور ہمت سے رہنے کا کہا آسیہ نے نور کو فیکٹری جانے کی ہدایت کی کہ وہ دو دن تک فیکٹری میں موجود نہیں ہوگی چنانچہ اپنے Departement کے ساتھ ساتھ اُسے آسیہ کے Departement کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔ نور نے خوشی خوشی قبول کیا کہ وہ کوئی فکر نہ کرے وہ سب سنبھال لے گی پھر وہ فیکٹری کے لیے روانہ ہوگئی۔

کام کے لوڈ کی وجہ سے دیوتا سارا دن مصروف رہا۔ ٹینا کی کال بھی مس ہوگئی۔ اس نے سوچا تھا کہ گھر جاتے ہی کال کرے گا چنانچہ وہ فیکٹری میں اپنا سارا وقت مصروف رہا۔

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دیوتا نے اکرم سے کہا: ''اکرم وہ فائیل کا حامد اور رحمان کو علم نہیں ہونا چاہیے میں پورے ثبوتوں کے ساتھ انہیں اکسپوز کروں گا۔ ہم اس دفعہ ان دونوں کو فیکٹری ملک کے سامنے رکھیں گے تا کہ ان کو بھاگنے کا موقع نہ ملے۔''

''سر میں آپ کے علم میں ایک بات اور لانا چاہتا ہوں۔''

''سر! حامد اور رحمان فیکٹری کے لیبرز کو آپ کے خلاف ورغلا رہے ہیں اور انہوں نے کئی مرتبہ اپنے گھر میں فیکٹری کے مزدوروں کی دعوت بھی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ

کسی سازش میں مصروف ہیں۔

بھئی ایسے انسان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ اب ان کو بے نقاب کرنے کا وقت قریب ہے۔ اکرم اور دیوتا خاصی دیر تک اسی موضوع پر ہی بات کرتے رہے اور پھر دیوتا کو نور کا خیال آیا کیونکہ آسیہ دیوتا کو فون کر کے بتا چکی تھی کہ وہ اپنی ماں کی وفات کی وجہ سے فیکٹری دو دن تک نہیں آسکے گی۔ چنانچہ دیوتا پر ہی نور کو باحفاظت گھر پہنچانے کی ذمہ داری ہے جب تک آسیہ واپس ڈیوٹی پر نہیں آتی۔

مگر آج دیوتا کو خاصی دیر ہو چکی تھی اور نور کب کی گھر جا چکی تھی۔ دیوتا سارے رستے نورا کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہوگی یا نہیں؟

پھر اس نے ڈرائیونگ کے دوران ہی نور کو کال ملا دی۔

ہیلو سر السلام علیکم!

دیوتا کو سلام کا جواب اسی طرح موصول ہوتا تھا تھوڑا سا ٹوٹا ہوا مگر وہ پوری کوشش کرتا تھا کہ جواب دے سکے۔

''آپ کب گئیں فیکٹری سے؟ میں معذرت چاہتا ہوں میں مصروف رہا اور وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔''

''کوئی بات نہیں سر میں آپ کی ذمہ داری تو نہیں۔ میڈم آسیہ نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا میری وجہ سے میں بالکل خیریت سے پہنچ گئی ہوں اور کھانا بھی کھالیا ہے۔ نور ہلکا سا مسکرا دی'' دیوتا کو سُن کر تسلی ہوئی اور پھر خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا گیا دوسری طرف نور کو دیوتا کا اپنے لیے یوں پریشان ہونا ''محبت'' کی ایک قسم لگی وہ پھر سے دیوتا کے خیالوں میں کھو چکی تھی۔ اس نے اپنا قلم اُٹھایا اور احمد فراز کا شعر اپنی ڈائری میں لکھ دیا:

دل کو تیری چاہت پر بھروسہ بھی بہت ہے

اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

اپریل کا پہلا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اور صبح ہی سے سیالکوٹ کو ٹھنڈی ہواؤں نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ صبح سے ہلکی ہلکی بارش شروع تھی۔ نور چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے صحن کی طرف آئی اور صحن کو دیکھنے لگی بارش کے چھوٹے چھوٹے قطرے زمین پر گر رہے تھے۔ اُن کے نزول سے ایک سحر انگیز آواز نکل رہی تھی۔ پرندے خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک سحر طاری کر دینے والا دن تھا۔

نور درخشاں نے تھوڑا سا باہر آ کر آسمان کی طرف دیکھا تو آسمان سے پانی کی ایک چھوٹی سی بوند نور کے گلابی گال پر پڑی۔ پھر دوسری تیسری اور پھر ایک اور آسمان پر سیاہ بادل بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے آسمان کے سارے بادل اکٹھے ہو گئے۔ نور نے اپنا بازو باہر کی جانب بڑھایا ایک قطرہ نور کے ہاتھ پر گرا نور نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر پڑے ہوئے بارش کے قطرے کو بغور دیکھا اور اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی، یہ بالکل صاف، شفاف اور خالص تھا، بالکل اس بادل کی طرح جس سے اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ نور نے اپنے دونوں ہاتھ کرسی پر بیٹھے بیٹھے باہر نکالے لیکن اب کی بار بارش تیز ہو چکی تھی۔ نور کے سارے بازوؤں سمیت اس کے سارے کپڑے بھی بھیگ چکے تھے۔ نور لاعلمی میں بارش میں کافی دیر بھیگتی رہی اور پھر بی اماں نے اُس کو دیکھا تو کہا:

''میری چندا سردی ابھی گی نہیں۔ تمہیں سردی لگ جائے گی چلو جاؤ جا کر جلدی سے کپڑے تبدیل کرو۔'' نور شروع ہی سے بارش کو دیکھ کر یونہی پاگل سی ہو جاتی تھی اور اسی طرح بارش میں بھیگتی رہتی۔ بچپن تو گزر گیا مگر ہمارے اندر کہیں نہ کہیں ایک چھوٹا بچہ ضرور ہوتا ہے۔ جو ماحول کی تلخیاں دیکھنے کی وجہ سے سو جاتا ہے مگر اس بچے کو جگانے کے لیے ہمیں خود تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ ہمیں کبھی بھی اپنے اندر کے اس چھوٹے بچے کو مرنے نہیں

دینا چاہیے۔

آج اتوار کا دن تھا دیوتا صبح سے ہی اپنے لیپ ٹاپ کو پکڑے ہوئے مختلف ریسرچ کر رہا تھا وہ ریسرچ کسی دفتری کام کے سلسلے میں نہیں تھی بلکہ وہ نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر وہ اس بات کو بھی تسلیم کر چکا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عظیم انسان پیدا نہیں ہوا۔ اُس نے مائیکل ہارٹ کی کتاب: ۱۰۰ عظیم انسان میں بھی حضور ﷺ کا ذکر پہلے نمبر پر پڑھ لیا تھا۔

اخلاص، ہمدردی، رحم دلی، صداقت، ایمانداری اور سب سے بڑھ کر غیر مسلموں کے لیے اُن کے بارے میں پڑھنے کے بعد دیوتا حیران تھا وہ عظیم انسان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو غیر مسلم کا اتنا خیال رکھنے والے انسان تھے۔ اُن کے ساتھ کھانا کھانا اُن کے حقوق کا خیال رکھنا اور سب سے بڑھ کر کئی مقامات پر دیوتا نے غیر مسلموں کو اس قدر نرم گوشہ دیکھ کر وہ از خود متاثر ہوا۔

دیوتا سوچ رہا تھا آج جب سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے اور ہر کوئی نئے نئے علوم سیکھ رہا ہے تو دیوتا کو بھی پورا حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں مزید جانے اور یہی سوچ کر وہ نبی کریم کی زندگی کو مطالعہ کر رہا تھا۔ اور اس مقام پر بہت نزدیک تھا کہ وہ اپنے دل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور عظمت کو محسوس کر رہا تھا۔

خیالات کی وجہ وہ خواب تھا جو دیوتا ایک بار سے زیادہ دیکھ چکا تھا۔ جس میں ایک بزرگ دیوتا کی انگلی پکڑ کر اسے کسی نور کی طرف لے جاتے ہیں اور پھر دیوتا کو وہ بزرگ کہتے ہیں۔ ”عبداللہ اپنی آنکھیں کھولو اور سامنے دیکھو“ ہر دفعہ دیوتا کا خواب ٹوٹ جاتا اور جب وہ آنکھیں کھولتا تو وہ خود کو اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر پسینے میں تڑپا تا۔

دیوتا نے جب اپنا خواب خان بابا کو بتایا تو خان بابا نے کہا ”بیٹے ایسا شرف تو

نصیب والوں کو ملتا ہے اللہ تمہیں ...... کر رہا ہے اپنی ہدایت کی روشنی تمہارے اندر ڈال رہا ہے اپنے آپ کو پہچانو اور حق کے رستے کو تلاش کرو۔

دیوتا نے پوچھا ''خان بابا حق کا راستہ کون ساہ؟''۔تو خان بابا مسکرا کر کہنے لگے: ''بیٹا حق کا راستہ ہی تو اللہ کا راستہ ہے جو اس کے اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کے عین مطابق ہو۔'' بس اُسی دن سے دیوتا اس بات کی تلاش میں تھا کہ حق کے راستے کو پانے کا اصل طریقہ کیا ہے؟ اور پھر دیوتا نے اپنے اندر کے دیوتا کو مار کر خود کو اس خواب والے بزرگ کے دیئے ہوئے نام ''عبداللہ'' کو اپنے دل میں تسلیم کرلیا۔

نور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بخار میں مبتلا ہوگئی اور سارا دن بخار میں تپتی رہی۔ فرخندہ اُس کے سرہانے بیٹھ کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی رہی اور ساتھ اس کی لاپرواہی جو کہ بارش میں صبح بھیگتی رہی پر خوب ڈانٹ بھی پلا رہی تھی۔ دوپہر کو میڈیسن کا کچھ اثر ہوا تو اسے ہوش آئی مگر بخار اپنا اثر دیکھا کر ہی جاتا ہے۔ ویسے ہی بدلتا موسم تھا۔نور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی چنانچہ غروب آفتاب تک یونہی بستر پر پڑی رہی۔

نور کے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف آسیہ تھی جو آگے روز فیکٹری میں آنے کا نور کو بتا رہی تھی۔

نور کی مسلسل خاموشی پر آسیہ نے نور سے پوچھا: ''وہ ٹھیک تو ہے'' بعد میں پتہ چلا کہ نور کو بخار ہے تو آسیہ نے کہا: ''نور تم اپنا خیال بالکل نہیں رکھتی۔عجیب بچوں والی عادات کی مالک ہو کیا ضرورت تھی یار بارش میں بھیگنے کی۔''

آسیہ نے خوب ڈانٹ کر اپنی بھڑاس نکالی پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

پھر آسیہ نے نور کو بتایا کہ ''وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے فیکٹری کے حالات کچھ ٹھیک نہیں۔''

......نور نے جاننا چاہا۔

''بس یار تمہیں بھی نظر آتا ہے کہ حامد اور رحمان دونوں شیطان کافی لیبرز کو اپنے ساتھ ملا کر دیوتا کی طرف سے لیبرز کو ورغلا رہے ہیں جو کہ کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ نظر آ رہا ہے۔ اپنے مفاد اور لالچ کی خاطر کسی بھی حد سے گزر جاتے ہیں تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں؟ نور'' آسیہ نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

نور خاموشی سے سنتی رہی اور پھر بولی ''لوگ اس حد تک لالچ میں گر چکے ہیں کہ اُن کو اپنی موت بھی یاد نہیں۔'' پھر وہ آسیہ کو بتانے لگی کہ کل وہ لاس اینجلس کے ڈاکٹر ابراہام کا ایک تجربہ پڑھ رہی تھی۔

آسیہ نے کہا میں ''سننا چاہوں گی اگر تم ٹھیک ہو تو؟''

''میں نے پڑھا کہ لاس اینجلس کے ڈاکٹر ابراہام نے انسانی روح کا وزن معلوم کرنے کے لیے نزع کے شکار لوگوں پر پانچ سال میں بارہ سو تجربے کیے۔

اس سلسلے میں اس نے شیشے کے باکس کا ایک انتہائی حساس ترازو بنا دیا وہ مریض کو اس ترازو پر لٹاتا، مریض کے پھیپھڑوں کی آکسیجن کا وزن کرتا، ان کے جسم کا وزن کرتا ہے اور مرنے کا انتظار کرتا ہے مرنے کے فوراً بعد اس کا وزن نوٹ کرتا ہے

ڈاکٹر ابراہام نے سینکڑوں تجربات کے بعد اعلان کیا کہ انسانی روح کا وزن ۲۱ گرام ہے۔

ڈاکٹر ابراہام کا کہنا ہے کہ انسانی روح......''

نور کو کھانسی ہوئی اور پھر اس نے اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی۔

''ڈاکٹر ابراہام کا کہنا ہے کہ انسانی روح اس ۲۱ گرام آکسیجن کا نام ہے۔ جو پھیپھڑوں کے کونوں، کھدروں، درزوں اور لکیروں میں چھپی رہتی ہے۔ موت آخری ہچکی کی صورت انسانی جسم پر وار کرتی ہے اور پھیپھڑوں کی تہوں میں چھپی اس ۲۱ گرام آکسیجن کو

باہر دھکیل دیتی ہے۔اس کے بعد انسانی جسم کے سارے سیل مر جاتے ہیں اور انسان فوت ہو جاتا ہے......!!''

نور معصومیت سے بولے جا رہی تھی اور آسیہ کو اپنی ماں کا وقت نزع یاد آ رہا تھا اور وہ نم آنکھوں سے نور درخشاں کو سن رہی تھی۔

''میڈم آسیہ آپ کو پتہ ہے ۲۱ گرام کتنے ہوتے؟'' نور نے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی بات کو جاری رکھا۔

''۲۱ گرام لو ہے کے ۱۴ چھوٹے سے دانے ہوتے ہیں ایک ٹماٹر یا پیاز کی ایک پرت، ریت کی چھ چٹکیاں یا پانچ ٹشو پیپر کا وزن...... یہ ہے ہماری اور آپ کی اوقات

ہم بھی کیا لوگ ہیں ہم ۲۱ گرام کے انسان خود کو نا متناہی وزنی کائنات کا خدا سمجھتے ہیں۔

مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر روح کا وزن ۲۱ گرام ہے تو ان ۲۱ گراموں میں، ہماری خواہشوں کا وزن کتنا ہے؟؟؟

اس میں ہماری نفرتیں لالچ، ہیرا پھیری، چالاکی، سازشیں ہماری گردن کی اکڑ، ہمارے لہجے کے غرور کا وزن کتنا ہے؟'' آسیہ دھیان سے نور کو سن رہی تھی۔اور سوچ رہی تھی یہ چھوٹی سی لڑکی نے تو انسان کو انسان کی زندگی میں آنے کا مقصد بتانے میں مصروف ہے۔

نور پھر رک کر بولی۔

''میڈم آسیہ آپ نے کبھی سوچا کہ کیلنڈر پر جب ۲۰ کی جگہ ۳۰ کا ہندسہ آئے گا تو نا آپ ہوگی نہ میں ہوگی اور نہ ہمارے اردگرد رہنے والے لوگوں میں کوئی موجود ہوگا۔''

نور نے آسیہ کو گہری سوچوں میں غرق کر دیا۔

حامد اور رحمان دنیا کو دھوکا دے سکتے ہیں مگر اللہ کے حضور ان کو جواب دہ ہونا پڑے گا اور اپنے اعمال کا خوب حساب دینا ہوگا اُس دن نا کوئی معافی قبول کی جائے گی اور

نہ ہی توبہ کا وقت ہوگا۔''

نور کو یہ بات کرتے ہوئے پھر سے کھانسی ہوئی تو آسیہ نے اسے مزید بات کرنے سے منع کر دیا اور آرام کرنے کا کہا۔اور ساتھ کرونا کا ٹیسٹ کروانے کی تنبیہ بھی دی اور پھر رسمی گفتگو کے بعد کال بند ہوگئی۔

مگر نور کی باتوں کی وجہ سے آسیہ ابھی بھی کرسی پر بیٹھی ہوئی مسلسل سوچ میں گم تھی۔پھر اس نے دیوتا کو نور کی بیماری کے بارے میں بتایا۔

دوسری طرف نور صحن میں بیٹھی ہوئی تھی اور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے گننے کی کوشش کر رہی تھی۔کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو بی اماں دروازہ کھولنے کے لیے مڑی تو سامنے دیوتا تھا۔بی اماں نے فوراً پہچان لیا اور اندر آنے کے لیے کہا'' آجاؤ بیٹا'' ادھر جب نور نے دیوتا کو اندر آتے ہوئے دیکھا وہ جلدی سے مڑی اور چار پائی کے کونے میں پڑا ہوا اپنا دوپٹہ سر پر اوڑھنے لگی۔دیوتا دیکھ رہا تھا نور سلیقے سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔سفید دوپٹے اور ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں وہ پہلے سے قدرے کمزور دکھائی دے رہی تھی۔''بیٹھیے نور آپ کھڑی کیوں ہوئی میں تو بس یہاں سے گزر رہا تھا تو آسیہ نے آپ کی طبیعت کا بتایا تو یہاں چلا آیا آپ کو پوچھنے ا۔مید ہے آپ کو میرا یوں آنا بُرا نہیں لگا ہو گا'' دیوتا نے شرمندہ سے انداز میں کہا تو بی اماں عادتاً بولی''نہیں نہیں بیٹا ایسے کیوں کہا تم جب مرضی آؤ تمہارا اپنا گھر ہے۔میں آتی ہوں تمہارے لیے چائے بسکٹ لے کر'' اور بی اماں یہ کہہ کر اندر چلی گئیں۔

''نور میں آپ سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔امید ہے کہ آپ ان پر عمل کریں گی'' نور آپ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتی ہیں؟ ضروری نہیں زندگی میں ہر چیز میسر ہو ہمیں بعض دفعہ بہت سے لوگوں کو اپنی زندگی سے نکالنا ہوتا ہے خود کو ان اذیتوں، ان اندھیروں سے نکالنا ہوتا ہے جو ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہوں اور یہ سب کچھ ہمارے لیے کوئی اور

نہیں بلکہ ہماری اپنی ذات نے کرنا ہوتا ہے اور یہی ہماری عزت نفس کا تقاضا ہے.....'' دیوتا بھی نور کی طرح رک رک کر بولنے لگا تھا۔

نور اپنی ہتھیلیاں گود میں رکھے گردن جھکائے دیوتا کے لہجے کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اور پھر ہمت کر کے بولی: ''پر سر......اتنی بڑی دنیا میں ہمیں کوئی ایک شخص ہی کیوں پیارا لگنے لگتا ہے اور ساری دنیا اُس کے سامنے حقیر لگتی ہے؟'' دیوتا نے نور کی آنکھوں میں محبت نہ ملنے کی بے بسی پڑھ لی تھی۔ مگر وہ اسے کسی دھوکے میں رکھنے کا کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے چند الفاظ کہے۔ جس کے بعد نور کا دل سکون سے بھر گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''نور اگر یہ جہاں نہیں سہی تو اگلے جہاں تم اپنی محبت کو پا لو گی۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھو'' دیوتا نے نور کو اپنا خیال رکھنے کا کہا اور چائے پیئے بغیر ہی چلا گیا مگر جاتے جاتے نور کو ایسی امید دے گیا جس کے سہارے وہ ساری زندگی بھی دیوتا سے محبت کر سکتی تھی۔

شام چھ بجے کا وقت تھا دیوتا کے فون پر گھنٹی بجی تو دوسری طرف ننھا راون اپنی توتلی آواز میں بولا:

''ہیلو پاپا کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہو راون؟ کشور کیسا ہے؟''

میں بھی ٹھیک ہوں پاپا کشور اپنے سکول کا ہوم ورک کر رہا ہے پھر راون کہنے لگا پاپا آپ کو ایک بات بتاؤں آپ کسی کو بتائے گے تو نہیں؟'' ''نہیں بیٹا بتاؤ'' دیوتا نے پیار سے کہا۔

''پاپا میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں اور رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو میں آنکھیں کھول کھول کر روتا ہوں تو پھر.....'' راون رک گیا دیوتا اس کی آواز میں آنسوؤں کی

لرزش محسوس کرسکتا تھا پھر دیوتا نے کہا: Papa Miss you alot my son I love you. ادھر دیوتا کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑے اتنے میں کشور راون سے لڑنے لگا مجھے دوفون میں نے بھی پاپا سے بات کرنی ہے۔

پھر کشور دیوتا سے بات کرنے لگا۔

''پاپا آپ کو پتہ ہے ہمارے سکول فنکشن میں مَیں نے دوڑ میں حصہ لیا ہے میرا بہت دل کرتا ہے آپ بھی وہاں موجود ہوں کیونکہ سارے بچوں کے والدین موجود ہوتے ہیں کیا ایسا نہیں ہوسکتا پاپا؟''

کشور یہ بات کر کے چپ ہوگیا اور دیوتا کی ہاں کا انتظار کرنے لگا۔

[[''کب ہے آپ کا فنکشن کشور؟ دیوتا نے پوچھا۔''

''پاپا آج سے ٹھیک چار دن بعد ہفتہ کے دن 25 March کو!''

''25 مارچ کو؟''

دیوتا نے دوہرایا

''جی پاپا 25 مارچ ہفتہ کے دن سب سے بڑا فنکشن ہوگا ہمارے سکول کا مقابلہ دوسرے کئی سکولوں کے ساتھ ہوگا بہت زیادہ لوگ آئیں گے۔ پلیز پلیز پاپا آپ آ جائیں نا؟'' دیوتا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کشور کو کیا جواب دے چنانچہ اس نے ''ہاں'' کہہ دیا۔

یہ اس نے کیوں کہا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا مگر اس وقت اسے اپنے معصوم بچے کی مسکراہٹ سب سے زیادہ عزیز تھی راون اور کشور بہت خوش ہوئے فون پکڑے بھاگتے بھاگتے ٹینا کے پاس آئے ''ماما ماما آپ کو پتہ ہے؟''

''پاپا آ رہے ہیں پاپا آ رہے ہیں۔'' فون ٹینا کو دے کر راون اور کشور کبھی دادی کے پاس کبھی دادا کے پاس سارے گھر میں شور مچاتے پھر رہے تھے ''پاپا آ رہے ہیں۔''

''کیا آپ واقعی آ رہے ہیں؟''

ٹینا نے سنجیدگی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں دیوتا کو کہا۔

''دیوتا نے کہا نہیں ٹینا ایسی کوئی بات نہیں وہ تو راون ایسے ضد کر رہا تھا تو میرے منہ سے ہاں نکل گیا۔''

''کیا؟'' ٹینا نے حیرت سے کہا

''آپ میرے بچوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔ دیوتا آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو پتہ ہے راون اور کشور سارے گھر میں خوشی سے شور مچا رہے ہیں کہ پاپا آ رہے ہیں اب میں ماتا اور پتا کو کیا بتاؤں گی کہ آپ نے صرف بچوں کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولا کتنا ناراض ہوں گے وہ۔''نہیں ہوتے ناراض ماتا کو پتہ ہے میرا، دیوتا نے ٹینا کو ٹوکا۔''

''اچھا ٹینا میری ایک بات سنو'' دیوتا کی آواز میں اسی بلا کی سنجیدگی ٹینا نے پہلے کبھی نہیں محسوس کی۔

''اگر......اگر مجھے کبھی کچھ ہو گیا؟'' دیوتا نے رک رک کر کہا۔

''میری جان کیوں نکال رہے ہیں آپ دیوتا ایسی باتیں کر کے؟ بدھا کی کرپا ہو آپ پر۔ آپ ایسی بات کیوں کر رہے ہیں؟''

ٹینا نے دیوتا کی آدھی بات پر ہی اسے ٹوکا۔

''میری جان ایسے ہی سوچ آئی کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بعد بچوں کا اور ماتا پتا کا خیال رکھنا اُن کو کبھی میری کمی محسوس مت ہونے دینا اور ہاں راون اور کشور کو کسی مقام پر پہنچانا کہ دنیا رشک کرے اور سب کہیں کہ یہ دیوتا کے بیٹے ہیں اور آخری بات...... اپنا بہت سا خیال رکھنا۔ خوش رہنے کی کوشش کرنا اور کبھی میری یاد آئی تو راون اور کشور کو دیکھ لینا دیوتا باتیں کرتے بھول گیا کہ ٹینا کی سسکیاں بلند ہو رہی ہیں۔

''اوہ! اوہ! آئی ایم رئیلی سوری میری جان ہاہاہا میں تو مذاق کر رہا تھا ایسے ہی۔''

''یہ بھی کوئی مذاق ہے آپ کو کسی کی سانس بند کرنے کا حق حاصل نہیں دیوتا کمار صاحب''

ٹینا نے روتے ہوئے غصے سے کہا اور فون کاٹ دیا دیوتا کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور اس نے دوبارہ کال ملا دیا۔

اب کی دفعہ دیوتا نے وہی حربہ آزمایا جس پر ٹینا ہمیشہ ہار جاتی تھی۔

''I am realy sorryٹینا I Love You''

''میں اب کبھی ایسی بات نہیں کروں گا'' یہ جادوئی الفاظ ایسے تھے کہ ٹینا ان پر پگھل کر موم بن جاتی تھی اس طرح دونوں مسلسل دو گھنٹے بات کرتے رہے اور پھر خان بابا نے کہا صاحب کھانا لگ گیا اور دیوتا کو مجبوراً فون بند کرنا پڑا۔

دیوتا کو نہیں معلوم کیا ہوا کہ اس نے دو گھنٹے ٹینا سے بات کرنے کے بعد پھر دوبارہ کال ملا دی اور کہا کہ راون اور کشور کا بہت خیال رکھنا اور راون کے سکول فنکشن میں شرکت ضرور کرنا ٹینا۔

''اچھا دیوتا تم پریشان کیوں ہو رہے ہو میں سمجھا دوں گی تم جاؤ جا کر کھانا کھاؤ اور اپنا بہت سا خیال رکھنا۔'' اور پھر سے دیوتا نے ٹینا کو تین جادوئی الفاظ I love you کہے اور ٹینا نے بھی جواباً I Love you too کہا اور پھر کال بند ہوگئی مگر دیوتا اور ٹینا کے لبو ں پر محبت کی مسکراہٹ لودے رہی تھی۔ یہ پاکیزہ حلالی محبت ایسی ہی ہوتی ہے مہکتی رہتی ہے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ اس کے بعد دیوتا اُٹھ کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔'' آئیں نا خان بابا مل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

دیوتا آج بہت خوش نظر آ رہا تھا کیوں کہ آج اس نے بہت دیر بعد ٹینا سے اتنی لمبی گفتگو کی تھی۔

''نہیں بیٹا میں بعد میں کھالوں گا آپ کھائیں'' ''نہیں خان بابا آپ کو پہلے بھی

کہا کہ میرے ساتھ کھانا کھایا کریں چلے آئیں'' اور پھر دیوتا نے خان بابا کی پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول ڈالنا شروع کیے تو خان بابا آگے بڑھ کر خود ڈالنے لگے۔ پھر یوں دیوتا اور خان بابا خاصی دیر باتیں کرتے رہے اور دیوتا کے زیادہ تر سوال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک کے اردگرد ہوتے تھے اور خان بابا بہت عمدگی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس کھانے کے دوران کیسی ہوتی تھی؟ بتا رہے تھے۔ ایک سوال پر بتانے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کون سی چیز کھانے میں زیادہ پسند تھی اس بات کا لوگوں کو بھی علم اس لیے تھا کیوں کہ میرا ناقص علم یہ کہتا ہے کہ وہ ذات اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی خوشی سے کرتی رہی انہوں نے کبھی سامنے آئے کھانے میں نقص نہیں نکالا۔

خربورہ پسند نہیں تھا مگر بہت کم لوگ جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں کبھی خربوزہ نہیں کھایا اور پھر ہمارے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال جب تک زندہ رہے کبھی خربوزہ اس لیے نہ کھایا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کھایا تھا۔

'واہ کیا شان میرے آقا کی اور اس کے غلاموں کی'

اللہ، اللہ، خان بابا کی باتیں دیوتا خاموشی سے سن کر دل ہی دل میں ایسی ذات کو محسوس کرتا کہ وہ کیا ذات ہوگی جس کے چاہنے والے بھی ولی اللہ بن گئے۔ پھر خان بابا نے درود پاک پڑھا۔

اور پھر دیوتا نے درود پاک کا ترجمہ دل میں دُھرایا۔ جو اس نے باقاعدہ یاد کر رکھا تھا۔

"May Allah Send Prayers and Peace upon his beloved Muhammad and his family."

دیوتا اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور پھر وہی ناول نکال کر "The death of a Hero" پڑھنے لگا جس کو وہ مصروف ہونے کی وجہ سے ختم نہ کر سکا تھا۔

یہ کتاب کا تیسرا حصہ تھا جو دیوتا پڑھ رہا تھا اور بڑی تیزی کے ساتھ اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔

جارج فوج کی تربیت حاصل کرتا ہے اور اسے فرانس بھیج دیا جاتا ہے۔ فرانس میں کسی خاص مقام کا ذکر نہیں کیا گیا ہوتا یہ وہ علاقہ ہوتا ہے جو محاذ کے پیچھے والا قصبہ جہاں جارج اپنا وقت زیادہ تر گزارتا ہے۔ اس علاقے کو 'M' کا نام دیا جاتا ہے۔

وہ کچھ دیر محاذ پر ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اور کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا ہے۔

اگلے حصے میں وہ جب گھر لوٹتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی اس سے بے وفائی کر چکی ہے اور کسی اور سے شادی کر چکی ہے وہ اس کے واپس آنے کا انتظار نہیں کرتی۔

جارج بھی اپنی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے ایک فوجی جوان کی طرح اپنی بیوی اور اُس کے عاشق اور اپنی فیملی تک کو بھلا کر اپنی زندگی نئے محاذ پر گزارنے کا ارادہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ تعلقات اُسے کمزور کر دیں گیں۔ جب وہ دوبارہ محاذ پر پہنچتا ہے تو سامنے خونی منظر ہے اُس کے بڑے بڑے افسروں سمیت بہت سارے جوان مارے جا چکے ہیں۔

جب جارج کی یونٹ میں بہت سارے افسر مار دیئے جاتے ہیں تو جارج کو ترقی دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا جذبہ جوان ہے اور وہ سب فوجیوں میں سے سب سے دلیر ہے جو ہر آنے والی مشکل کا مقابلہ ڈٹ کر، کر سکتا ہے۔

جارج بھی اپنے عہدے کا پاس رکھتے ہوئے پوری دل جمعی سے کام کرتا ہے مگر اس کے ساتھ افسر ہر وقت یونٹ میں وقت گزارتے ہیں کیس ہاکتے ہیں اور شراب وعیش میں پڑے ہوتے ہیں۔

جارج ان سب سے ہٹ کر اپنا ایک الگ مقام بنانا چاہتا ہے وہ ان کو سمجھتا ہے کہ یہ لوگ مفاد پرست ہیں۔ لالچ اور حوس کا شکار ہیں جو اپنے وطن کے غدار ہیں۔ وہ ان سب کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر دوسرے سارے افسر مل جاتے ہیں اور اس طرح جارج اپنی عزت اور مقام کھو دیتا ہے بے شک وہ حق پر تھا مگر کوئی اُس کی بات پر یقین نہیں کرتا۔

جارج پھر بھی ہمت سے آگے بڑھتا ہے۔ اور اپنی ڈیوٹی ایک فوجی جوان کی طرح ادا کرتا ہے یہ کہانی کا اختتام تھا جب جارج مشین گن بیراج پر کھڑا ہوتا ہے۔ مگر دشمن کی ایک وار کا شکار ہو جاتا ہے اور اُسے مار دیا جاتا ہے۔

اس کی موت کا منظر اور نقش Richard Aldingto بہت دردناک طریقے سے بتاتا ہے مگر اس کی بہادری پر Richard کی پوری نظر ہے کہ جارج مارا گیا مگر وہ پھر بھی ہیرو ہی رہا اس کے ساتھ ہی دیوتا کتاب اپنے چہرے پر رکھے سو گیا۔ کیونکہ آج کے دن دیوتا کا تھکا دینے والا دن تھا سارا دن وہ ذہنی طور پر حق اور باطل کی جنگ لڑ رہا تھا اور جب جیت حق کی ہوتی ہے تو نیند خود بہ خود سکون دینے لگتی ہے۔ دیوتا گہری نیند میں تھا۔

"''عبداللہ' عبداللہ اُٹھو، ہمارے ساتھ چلو۔''

دیوتا اٹھ گیا سامنے ایک بزرگ تھے جو اُسے اکثر خواب میں نظر آتے تھے اور اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔

دیوتا سے کچھ بولا نہیں گیا بزرگ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر دیوتا چپ چاپ اُن کے ساتھ چل دیا۔

پھر اچانک دیوتا کی آنکھ کھلی تو اسے خیال آیا وہ خواب میں تھا۔ بزرگ ہستی غائب ہو چکی تھی۔ مگر دیوتا کا سارا کمرہ خوشبو سے بھر چکا تھا۔

دیوتا نے وقت دیکھا تو 4:55 ہوئے تھے دیوتا باہر آیا تو خان بابا نماز پڑھ رہے تھے۔

دیوتا واپس مڑا اور اپنے ہاتھ پاؤں منہ اچھی طرح دھو کر خان بابا کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اب خان بابا نے دیوتا کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے بلند آواز میں تکبیر پڑھی اور دیوتا بھی خان بابا کی طرح اشارے پر چلتے ہوئے تمہید، رکوع اور سجدے میں آیا۔

''یہ پہلا سجدہ کتنا پیارا ہوتا ہے اللہ کو۔ یہ اللہ کی ذات کے علاوہ اور اس انسان کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا جب ایک انسان سب دنیا کے خداؤں کو چھوڑ کر اُس ایک اللہ کو واحد مان کر اپنی پیشانی اس کی بارگاہ میں جھکاتا ہے تو وہ اللہ اس انسان کو اپنی آغوش رحمت میں لے لیتا ہے۔''

باب: 15

''صاحب''اس وقت گارڈ نے حامد اور رحمان کو صبح چھ بجے فیکٹری میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو پوچھا حامد نے کہا''اپنے کام سے کام رکھا کرو۔''

''ہم جب مرضی آئیں جائیں اگر فیکٹری ٹائم سے 2 گھنٹے پہلے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔''

رحمان نے بھی اپنا حصہ ڈال دیا۔

''نہیں سر میں نے تو ویسے ہی کہا تھا۔معذرت چاہتا ہوں اگر آپ کو برا لگا ہے۔تو۔''

رحمان اور حامد چھت کی طرف جا رہے تھے وہ کچھ پوسٹر پکڑے ہوئے اب دیوتا کے آفس کی طرف بڑھے۔

اِنھوں نے نبی کریم کے نام کے پوسٹر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیوتا کے ٹیبل کے نیچے پڑی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔

اور پھر جلدی سے اپنے آفس میں آ کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اللہ دیتہ خاکروب کو آفس میں بلایا اور اس کو سارا کام سمجھا دیا کہ وہ کیا کام کرے گا اور اُس کو کتنے پیسے دیئے جائیں گے۔

اللہ دیتہ خاکروب بھی لالچ میں اندھا ہو گیا اور یوں حامد اور ان کے علاوہ افراد اس سازش کو سوچنے میں مصروف ہو گئے آج سب فیکٹری وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔

لالچ،حرص،حسد اور تکبر انسان کو اس کے اشراف مخلوقات کے درجے سے کس طرح گرا دیتا ہے یہ حامد اور رحمان نے آج ثابت کر دیا تھا۔

نور کی حالت پہلے سے قدرے بگڑ گئی بی اماں اور فرخندہ صبح صبح ہی اسے ہسپتال لے گئی تو پتہ چلا کہ نور کو کووڈ پوزیٹو ہے اور اس کی وجہ سے اس کے گردے کافی حد تک متاثر ہو چکے تھے۔

آسیہ کے فون کال پر فرخندہ نے نور کی ساری صورت حال بتا دی جس پر آسیہ گہرے صدمے سے دوچار ہوئی مگر اس نے کہا آپ ہمت رکھیں خالہ سب ٹھیک ہو جائے گا میں کچھ رقم کا انتظام کرلوں پھر میں آپ تک پہنچتی ہوں۔

دیوتا ناشتہ کر رہا تھا کہ اسے یونہی خیال آیا اور وہ راون اور کشور کی تصویر نکال کر دیکھنے لگا جو کل رات ٹینا نے دریا کی سیر کے دوران بنا کر بھیجی تھی۔

خان بابا دیوتا کے چہرے کو پڑھ کر بولے ''دیوتا بیٹا، آج دیر ہوگئی ہے، پہلے سے''

''جی خان بابا بس۔''

''ناشتہ کرلو بیٹا'' خان بابا نے دیوتا کو آدھا ناشتہ چھوڑتے ہوئے کہا ''نہیں خان بابا بس کھالیا جتنا کھانا تھا۔''

لیپ ٹاپ کندھے پر ڈالتے ہوئے خان بابا دیوتا کو بغور دیکھ رہے تھے کیونکہ آج یہ دیوتا نہیں تھا بلکہ فجر کی نماز پڑھنے والا ایک نمازی بن چکا تھا۔ خان بابا کو آج دیوتا پر بہت پیار آ رہا تھا۔

دیوتا باہر گاڑی تک آیا تو خان بابا نے کہا ''بیٹا یہ گھڑی رہ گئی'' تو پھر دیوتا نے ہاتھ آگے کیا خود ہی باندھ دیں خان بابا اور یوں دیوتا فیکٹری کے لیے روانہ ہوگیا۔

خان بابا دروازے سے باہر آ کر گاڑی کو دور تک جاتا ہوا دیکھ سکتے تھے اور پھر دھندلا سا منظر اور پھر سب کچھ غائب......

دیوتا نے اپنی گاڑی کی سامنے والی سیٹ پر فون کی گھنٹی کی آواز سن رہا تھا۔

آسیہ: ''ہیلو دیوتا السلام علیکم''

دیوتا: ''وعلیکم السلام''

آسیہ: ''میں آسیہ بات کر رہی ہوں دیوتا''

دیوتا: ''جی آسیہ سب خیریت ہے صبح صبح آپ کی کال''

دیوتا حیران ہوا۔

آسیہ: ''دیوتا وہ اصل میں بات ہی ایسی تھی''

دیوتا: ''جی بولیں میری بہن''

آسیہ: ''نور''

دیوتا: ''جی کیا ہوا انہیں سب خیریت؟''

اصل میں اسے کووڈ پوزیٹو ہے اور اس کے گردے بھی کافی متاثر ہیں آپ کو تو پتہ ہے اس کے گھر کوئی کفیل بھی نہیں جو ان کی مدد کر سکے تو میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں مل کر نور کا علاج کراتے ہیں۔'' ''او میرے خدایا!'' دیوتا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے کہا'' یہ تو بہت بڑی خبر سنائی آپ نے۔ آسیہ میری بہن میری طرف سے آپ کو ابھی امداد کا چیک وصول ہو جائے گا۔ آپ نور کی صحت کا خاص خیال رکھیں اور میری طرف سے اسے پوچھیے گا میں فارغ ہو کر چکر لگاؤں گا۔''

دیوتا کی گاڑی فیکٹری کے اندر داخل ہوگئی اور دیوتا اپنی گاڑی سے اُترا اور سیدھا دفتر جانے کے بجائے اکرم کے آفس کی طرف بڑھا اکرم موجود تھا۔

''اکرم یہ چیک آسیہ تک پہنچانا ہے اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔'' ''جی سر آپ فکر نہ کریں میں ابھی دے کر واپس آتا ہوں۔''

دیوتا نے مسکراہٹ سے اکرم کے کندھے پر شاباش والی تھپکی دی اور یوں وہ اپنی بائیک ہوا میں اُڑاتا ہوا ہسپتال کا رُخ کیا۔ چیک آسیہ کے حوالے کرتے ہی اکرم رُکا نہیں اور واپس فیکٹری گیا۔

ادھر دیوتا اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا تو دیکھا کہ سب دیوتا کے آفس کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اللہ دیتہ خاکروب نے شور مچایا ہوا تھا اور سب مزدور اُس کے اردگرد کھڑے تھے۔

اللہ دیتہ خاکروب نے دیوتا کے کرسی کے نیچے پڑی ہوئی کوڑے کی ٹوکری کو سامنے رکھ کر بین ڈال ڈال کر رو رہا تھا اور پھر کبھی ٹوکری میں سے کوئی ٹکڑا اُٹھاتا چومتا آنکھوں کو لگاتا اور روتا۔

''ہائے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی بے حرمتی کردی اس دیوتا بدھمت نے لعنت ہو اس شخص پر'' ایک اور شخص ''بولا استغفر اللہ'' اور یوں تیسرا بولا ''یہ توہین رسالت ہے سراسر ہمارے مذہب کی توہین ہو رہی۔ یہ توہین مذہب کا مرتکب ہے انسان کافر ہے'' پھر یکے بعد دیگرے آوازیں آنے لگی ''گستاخ رسول کی سزا سرتن سے جدا سرتن سے جدا۔'' یہی نعرے دیوتا کے کمرے میں بلند ہو کر ساری فیکٹری میں گونج رہے تھے۔ یہ سو سے زائد افراد دیوتا کے کمرے میں ہر چیز اُٹھا اُٹھا کر توڑ رہے تھے۔

دیوتا نے جب یہ آوازیں سنی تو وہیں سے واپس مڑا اور جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور پھر اس نے دیکھا ہجوم دفتر سے نکل کر اس کی گاڑی کی طرف آ رہا ہے۔

کسی کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی کرسی تھی تو کسی کے ہاتھ میں قینچی کسی نے ڈانڈا پکڑا ہوا تھا تو کسی نے لوہے کی بڑی سلاخ۔

مُستقل ہجوم کو دیکھ کر دیوتا بھاگ کر قریبی واش روم میں گھس گیا۔ جہاں پر اُسے جاتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔ دیوتا کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے یہ خیال آیا اور وہ قریبی واش روم میں چلا گیا۔

دیوتا واش روم میں بھی ان نعروں کی آواز با خوبی سن سکتا تھا۔

''گستاخ رسول کی ایک ہی سزا
سرتن سے جدا سر تن سے جدا''

دیوتا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھی وہ کیا کرے اس کو صرف اپنی آنکھوں کے سامنے راون اور کشور کے معصوم چہرے آ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے خوف کی شدت سے اس کے جسم کے ساتھ اس کے سوچنے سمجھنے کی اصلیت ختم کر رہے تھے۔

وہ لوگوں کو سمجھانا چاہتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کرتا ہوں مگر سنگدلی کہ زبان ان لیبرز کو سمجھ نہیں آنے والی تھی اور انگلش تو یہ سرے سے نہیں سمجھتے تھے دیوتا کو آج شدت سے احساس ہوا کہ اس کی زبان آج کتنا اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔

پھر دیوتا کو خیال آیا اس نے جلدی سے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور موبائیل فون تلاش کرنے لگا۔ آخر کار اسے موبائیل مل گیا اور پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اکرم کا نمبر ملا دیا۔

اکرم نے فون اٹھایا ''اکرم''......''اکرم''

دیوتا کے بات کرنے سے پہلے ہی اکرم دیوتا کے پیچھے آوازیں سن رہا تھا۔ جلدی سے بولا ''کیا ہوا سر سب ٹھیک ہے ناں؟''

''اکرم جلدی پہنچو میری جان کو خطرہ ہے۔ فیکٹری کے سارے مزدور مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ میں واش روم میں چھپا ہوا ہوں۔ ہجوم فیکٹری گیٹ پہ ہے۔ وہ مجھے فیکٹری میں ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں۔''

اکرم نے کہا ''سر آپ پریشان نہ ہوں میں فیکٹری کے قریب پہنچ گیا ہوں آپ ماسک کا استعمال کریں اور کسی طرح واش روم کے ساتھ بنی ہوئی سیڑھیوں سے چھت پر چلے جائیں میں آ کر سب سے بات کرتا ہوں۔''

دیوتا نے کال بند کی اور اچھی طرح سے ماسک لگایا اور جلدی سے واش روم کا دروازہ کھولا اور چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھا گا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیوتا دو دفعہ گرتے گرتے بچا کیوں کہ وہ گھبرایا ہوا تھا مگر آج شاید دیوتا کی بدقسمتی کا دن تھا دو مزدوروں نے دیوتا کو چھت کی طرف بھاگتے دیکھا سب مزدور یکے بعد دیگرے چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

اتنے میں اکرم بھی اس ہجوم کے پیچھے بھا گا اکرم اونچی اونچی آواز میں کہہ رہا تھا:

''رک جاؤ'' ''رک جاؤ'' ''میری بات سنو۔ا'' ''گر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں مگر قانون اپنے ہاتھ میں مت لو۔''

اکرم بار بار دھرا رہا تھا مگر فیکٹری کے سو سے زائد افراد کے نعروں میں اکرم کی آواز دب گئی۔

دیوتا نے دوسری منزل میں کمرے میں چھپنے کی بجائے سب سے بالائی منزل یعنی چھت پر چلا گیا۔ اُدھر دیوتا نے خود کو سولر پلیٹس کے نیچے چھپا لیا اور پھر اسے خان بابا کی ایک بات یاد آئی کہ جب ایک دن خان بابا کو دیوتا نے پریشان دیکھا تو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا ہسپتال ہے۔ وہ کچھ کلمات کا ورد کر رہے تھے۔

دیوتا کے پوچھنے پر خان بابا نے بتایا کہ درود پاک پڑھنے سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

چنانچہ دیوتا نے بھی درود پاک کا ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا:

"May Allah Send Prayers and Peace upon his beloved Muhammad and his family."

دیوتا بند آنکھوں سے یہ کلمات بار بار پڑھ رہا تھا کہ اچانک اُسے چھت کی سیڑھیوں پر بہت ساری آوازیں محسوس ہوئیں۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

راون اور کشور کے چہرے اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری کر رہے تھے۔

اور وہ ہجوم چھت میں ہر جگہ دیوتا کو تلاش کر رہا تھا۔ پھر ایک مزدور نے دیوتا کو دیکھ لیا اب سب اُس کی طرف یوں لپکے کہ جو بھی اُسے سب سے پہلے مارے گا وہی جنت کا اصل حقدار ہے۔ سب ثواب کی نیت سے اس معصوم انسان کو مارنے کا ارادہ کر چکے تھے۔

آٹھ مزدور سولر پلیٹس کے نیچے گھس گئے اور پھر دیوتا کو کسی نے بالوں سے کسی نے اس کی ٹانگ کو اور کسی نے اُس کے گریبان کو پکڑ کر باہر نکالا، بلکہ گھسیٹا۔

دیوتا بے بسی سے زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اتنے میں اکرم آ گیا اور دیوتا کے آگے کھڑا ہو گیا بلکہ اس کے اوپر لیٹ گیا اور اپنے بازو دیوتا کے آگے پھیلا دیئے۔ ''میری بات سنو'' اس نے ہاتھ جوڑ دیئے ''خدا کے لیے۔'' ''صرف ایک دفعہ میری بات سنو خدا کے لیے رسول اللہ کے صدقے اگر اس نے کوئی گستاخی کی ہے تو اسے پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں مگر جان سے مارنا کسی بھی طرح ناحق ہے۔ پاکستان کا نام بدنام ہو جائے گا۔ ایسے مت کرو۔''

اکرم نے اپنی ساری قوت لگا دی مگر نعرہ ایک ہی تھا:

گستاخ نبی ﷺ کی بس ایک سزا سر تن سے جدا سر تن سے جدا۔

اکرم دیوتا کے آگے تھا مگر پیچھے سے کسی نے دیوتا کے سر پر زور سے ڈنڈا مارا۔ دیوتا زمین پر گر گیا اور پھر ہجوم نے اکرم کو پیچھے دھکیل کر دیوتا پر لاتیں، ڈنڈے، گھونسے اور سلاخیں چلائیں۔

ہر کوئی ثواب سمجھ کر اپنا حصہ ڈال رہا تھا۔ دیوتا پر ایک ہجوم تشدد کر کے جب تھوڑا سا پیچھے ہٹتا تو ایک اور ہجوم اس طرح چڑھ آتا اور اس طرح دیوتا کو مسلسل ایک گھنٹہ تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ دیوتا کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور اس کے جسم کی تقریباً ہر ہڈی توڑ دی گئی۔

دیوتا کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور سانس ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہی تھی۔ پھر دیوتا نے

اپنی طرف انہی بزرگ کو آتے دیکھا جو اسے خواب میں کئی بار مل چکے تھے۔

"'عبداللہ' ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔"

دیوتا مسکرایا اور یوں دیوتا نے گہرا سانس لیا اور اس کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور دیوتا کی رُوح پرواز کر گئی۔

مگر باقی بچا ہجوم جس نے دیوتا کو اپنی طرف سے ابھی نہیں مارا تھا۔ آگے بڑھا حامد اور رحمان اُن میں پیش پیش تھے۔

اُس کی لاش پر لاتیں مارنے لگے۔ ڈنڈے سوٹے اور جس کے ہاتھ میں جو آیا اس نے وہی دے مارا۔

نعرے فضاء میں ویسے ہی بلند ہو رہے تھے۔ پھر رحمان نے کہا: "اُٹھاؤ اس گستاخ رسول ﷺ کو" سب نے اُس کو اُٹھایا اور پھر فیکٹری کی چھت سے زمین پر دے مارا۔

دیوتا کی لاش کی باقی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی۔ پھر یہ مشتعل ہجوم بھاگ بھاگ کر سیڑھیوں سے نیچے اُترا فیکٹری کے چھت سے پھینکی گئی دیوتا کی لاش کی طرف خون خوار بھیڑیوں کی طرح لپکے۔

دیوتا کو مار کر بھی اُن کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ پھر اُن سب نے اپنی اپنی جیکٹس اُتار دی اور پھر ایک پیٹرول لے آیا اُن کا ارادہ دیوتا کی لاش کو جلانے کا تھا۔ مگر پہلے ان سب نے مل کر دیوتا کی گاڑی توڑی اور اُس کو آگ لگائی پھر سب نے مل کر دیوتا کی لاش کو آگ لگا دی۔ آگ بند نہ ہو اس لیے کچھ لوگ اپنی جیکٹس اُتار اُتار کر آگ میں پھینک رہے تھے۔ اور ساتھ نعرے لگاتے رہے۔

"گستاخ رسول کی ایک ہی سزا

سر تن سے جدا سر تن سے جدا

ہم اپنے نبی کے دیوانے

ہم اپنے نبی کے دیوانے''

اس کو مارنے والے بھی مسلمان تھے اس کو بچانے والے بھی مسلمان تھے اور جس کو جلایا جا رہا تھا وہ خود ایک نومسلم تھا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ دیوتا نے مرتے وقت کلمہ نہیں پڑھا ہوگا؟

فضاء کالے دھوئیں اور کالے کارناموں سے سیاہ ہو رہی تھی اور دیوتا کے وہ ہاتھ جس نے کبھی قرآن پکڑا تھا وہ آنکھیں جس سے اس نے قرآن کے لفظ کو دیکھا اور محسوس کیا تھا اس کے وہ کان جس سے وہ روزانہ خان بابا کی تلاوت قرآن سنتا تھا اور اس کی پیشانی جس سے وہ آج سجدہ ریز ہو کر آیا تھا اور اس کے وہ گھٹنے جس سے آج وہ اللہ کے حضور رکوع دے کر آیا تھا۔ سب کچھ جلا کر خاک کر دیا گیا نور کو خبر مل چکی تھی وہ جب تک وہاں آئی سب کچھ خاک ہو چکا تھا وہ روڈ پر بیٹھ گئی خالی آنکھوں سے وہ کچھ بھی تو محسوس نہیں کر رہی تھی۔

جل بھی چکے پروانے ہو بھی چکی رسوائی

اب خاک اُڑانے کو بیٹھے ہیں تماشائی

تاروں کی ضیاء دل میں اک آگ لگاتی ہے

آرام سے راتوں کو سوتے نہیں سودائی

راتوں کی اُداسی میں خاموش ہے دل میرا

بے حس ہیں تمنائیں نیند آئی کہ موت آئی

اب دل کو کسی کروٹ آرام نہیں ملتا

اک عمر کا رونا ہے دو دن کی شناسائی

اک شام وہ آئے تھے اک شام فروزاں تھی

وہ شام نہیں لوٹی وہ رات نہیں آئی

اب تو وسعت عالم بھی کم ہے میری وحشت کو
کیا مجھ کو رلائے گی اس دشت کی پنہائی
جی میں ہے اس در سے، اب ہم نہیں اٹھیں گے
جس در پہ نہ جانے کی سو بار قسم کھائی
اب محفلِ دنیا میں کوئی بھی نہیں اپنا
شہزاد ہوئے بے دم کس کس کی تمنائی

نور کی دوبارہ طبیعت خراب ہونے کی صورت میں اسے ہسپتال لے جایا گیا وہ کومہ میں جا چکی تھی۔ اور ڈاکٹر بے بس تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے مگر دیوتا کی موت نے اُسے زندہ لاش بنا دیا۔

مقامی پولیس جب تک پہنچی لاش مکمل جل چکی تھی۔ یہ صبح گیارہ بج کر سولہ منٹ کا وقت تھا جب دیوتا کو زبردستی اس دنیا سے جانے پر مجبور کرنے والے اُس کی موت کا جشن منا رہے تھے۔

ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا۔ پورا سیالکوٹ شہر بند کر دیا گیا۔ ٹی وی اخبار اور غیر ملکی میڈیا چینل صرف دیوتا کی موت کو رپورٹ کر رہے تھے۔

''آئی ایس پی آر نے کہا کہ سری لنکن شہری کا قتل، سول انتظامیہ کی طرف سے ہر ممکن مدد کی جائے گی۔''

سربراہ پاک فوج نے کہا'' سری لنکن شہری کے قتل کو قابل مذمت اقرار دیا اور ذمہ داروں کو سزا کے سول انتظامیہ کی مدد کا اعلان کیا۔''

آئی ایس پی آر نے کہا'' کہ سیالکوٹ میں سری لنکن شہری کا قتل شرمناک ہے ایسے ماورائے عدالت قطع قابل قبول نہیں۔ ایسے افراد کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے سول انتظامیہ کی مدد کے لیے کھڑے ہیں۔'' پاکستان کے وزیر اعظم کی طرف سے بڑا بیان

سامنے آیا۔سری لنکن فیملی کی امداد کا اعلان کیا گیا۔

’’سیالکوٹ میں مشتعل افراد سری لنکن منیجر کا زندہ جلایا جانا پاکستان کے لیے ایک شرمناک دن ہے۔میں خود واقعہ کی نگرانی کر رہا ہوں۔میں دوٹوک الفاظ میں واضح کر دوں واقعہ میں ملوث افراد کو کڑی سزا دی جائے گی اس سلسلے میں گرفتاریاں جاری ہیں۔‘‘

دوسری طرف پولیس نے موقع پر پہنچ کر دیوتا کی لاش کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ پورسٹ مارٹم کی رپورٹ میں دیوتا کے جسم کا 99% حصہ جل چکا تھا۔اُس کی موت دماغ پر ضرب لگنے سے ہوئی ساری ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔وہی دماغ جو پاکستانی Exports بڑھانے کا ہر وقت سوچتا رہتا تھا۔

سری لنکن سفارت کار اور پاکستانی سفارت کار دیوتا کی لاش کو کولمبو لے جا رہے تھے۔

ٹینا کے لیے یہ قیامت کا سماں تھا اُس کا سب کچھ اُس سے چھین چکا تھا۔وہ سکتے میں تھی۔پھر ہوش آنے پر اُس نے ٹی وی پر اپنا بیان جاری کیا:’’اس کے معصوم شوہر کو ناحق قتل کر دیا۔اس کے مجرموں کو کڑی سزا دی جائے اور ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔‘‘

اُس کی آواز کی بے بسی بتا رہی تھی کہ وہ سب کچھ کھو چکی ہے ا۔س کو اگر کشور اور راون کا خیال نہ آتا تو شاید وہ خودکشی ہی کر لیتی۔

اُس کی محبت خاک اور راکھ کی صورت میں جب گھر پہنچی تو ایک کہرام برپا تھا۔ دیوتا کے ماتا پتا اور راون،کشور سب کے سب اس کے بھائی بھاوج رشتہ دار دیوتا کی میت کو دیکھ کر دل پیٹ رہے تھے۔

باہر لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو پاکستان کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے کہ پاکستان میں ہمارے شہری کو اس طرح قتل کیوں کیا گیا؟

بالآخر دیوتا کی آخری رسومات ادا کر دی گئی اور ٹینا دیوتا کو اُٹھائے ہوئے دیکھ

رہی تھی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے تھی اور دیوتا کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات سے لے کر محبت میں گرفتار ہونے سے شادی اور اپنی خوشحال زندگی کے بعد اس بھیانک خواب کو بھلانے کی سر توڑ جہد کر رہی تھی۔

گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ
حافظ خدا تمہارا حافظ خدا تمہارا
خوشیاں تھی چار دن کی آنسو ہیں عمر بھر کے
تنہائیوں میں اکثر روئیں گے یاد کر کے
وہ وقت جو کہ ہم نے اک ساتھ ہے گزارا
حافظ خدا تمہارا حافظ خدا تمہارا
میری قسم ہے مجھ کو تم بے وفا نہ کہنا
مجبور تھی محبت سب کچھ پڑا ہے سہنا
ٹوٹا ہے زندگی کا اب آخری سہارا
میرے لیے سحر بھی آئی ہے رات بن کر
نکلا میرا جنازہ میری برات بن کر
اچھا ہوا جو تم نے دیکھا نہیں نظارہ
گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ
حافظ خدا تمہارا حافظ خدا تمہارا

ٹینا اپنی سوچوں میں گم آنسو بہا رہی تھی پھر اسے ننھے ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوئے۔

یہ کشور تھا۔ ٹینا نے اپنی بند آنکھیں کھول کر دیکھا تو کشور رو رہا تھا اس کی کالی بڑی بڑی آنکھوں میں جب آنسو آتے تو اُداس چہرے کے ساتھ ٹینا کو اس کے اندر دیوتا نظر

آنے لگتا تھا۔ آج بھی اُسے یہی محسوس ہوا۔ ٹینا نے کشور کو آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ خوب رونے کے بعد ٹینا نے کشور کے بال سنوارتے ہوئے کہا ''اب نہیں رونا میرے بیٹے ماما ہے آپ کے پاس'' ''جی ماما'' کشور نے سر جھکاتے ہوئے کہا اور پھر کشور نے ایسی بات کہی جس سے ٹینا کو اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''ماما پاپا نے اگر آج ہفتہ کے دن یعنی 25 تاریخ کو آنے کا وعدہ کیا تھا تو پاپا نہ آتے بے شک میں ان کے بغیر بھی فنکشن میں چلا جاتا آج مگر پاپا ایسے تو نہ آتے۔'' آج بھی ہفتہ تھا اور 25 تاریخ تھی۔ ٹینا نے کشور کو گلے لگا لیا اور پھر آنسوؤں کا دریا بہنے لگا مگر اس دفعہ ٹینا نے اپنی آنسوؤں کے دریا میں شور نہ ہونے دیا وہ کشور اور راون کو مضبوط مرد بنانا چاہتی تھی۔ وہ اب آنسوؤں کو چھپائے گی اور ساری عمر اب اُسے چھپ کر رونا ہوگا اور راون اور کشور کے سامنے اُسے مضبوط بن کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اب راون اور کشور کا وہی آخری سہارا ہے۔

سول انتظامیہ کی موبائیل فوٹیج کی مدد سے 131 افراد حراست میں لے لئے گئے۔ حملے کی منصوبہ بندی کرنے والے افراد سمیت سب کو گرفتار کر لیا گیا۔

وزیر اعلیٰ نے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے سب کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔

اور پھر ٹھیک چار ماہ بعد مرکزی ملزم رحمان اور حامد کو سزائے موت کی سزا اور باقی سب افراد کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

تعزیرات پاکستان میں ایک آئینیشق 295 اور 298 کو قانون توہین رسالت کہا جاتا ہے جن میں سے ایک شق 295 سی کے تحت سنگین گستاخی کی سزا موت مقرر کی گئی ہے۔ 295 کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے جذباتی اذیت پہنچانے کی سزا جو کہ دس سال ہو سکتی ہے۔

اگر کوئی فرد ایسا کچھ بھی کرے تو اس کو قانون سزا دے سکتا ہے مگر ان سب نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خود سزا کے حقدار ٹھہرے۔ ہمارے معاشرے کو علم اور شعور کی کمی لاحق ہے۔ان کے اندر ہمدردی، بردباری اور انسانیت کے ساتھ محبت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ہم سب کو نبی کریم ﷺ کی سنت پر حقیقی معنوں میں اپنانے کی ضرورت ہے جو کسی کو تکلیف ناحق پہنچانے کے سخت خلاف تھے۔

نور کو کوما سے ہوش آ چکا تھا۔اس نے جب آنکھیں کھولیں تو اسے وہی روڈ پر جلتے ہوئے دیوتا کی ساری داستان تازا ہو چکی تھی۔وہ اپنے بیڈ سے اٹھ چکی تھی اپنی چادر کو سیدھا کرنے کے بعد وہ خاموشی سے ہسپتال کے روم سے نکلی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔دو زانوں وہ پھر روڈ کے کنارے آ کر اُسی جگہ بیٹھ چکی تھی جہاں دیوتا کو جلایا گیا تھا۔

یہ صبح چار بجے کا وقت تھا اور اُس وقت ٹریفک نا ہونے کے برابر ہوتی تھی اس روڈ پر وہ بیچ سڑک کے عین اسی جگہ پر جہاں دیوتا کو جلایا گیا تھا اپنی نازک پوروں سے اس کو محسوس کر رہی تھی۔اور اپنی ذہنی کیفیت سے لاشعور ہو کر دیوتا کے وہی الفاظ جو اس نے اسے آخری دفعہ کہے تھے دل میں دُھرا رہی تھی۔

اے معصوم لڑکی!
اے حیاء کی امین لڑکی!
کبھی جو میں تیری آنکھوں سے
اوجھل ہو جاؤں تو
تم ستاروں میں کبھی
تو کبھی چاند کی ساختوں میں
کبھی بادِ صبا میں میرا چہرہ تلاش کرنا
تو کبھی کسی بزرگ کی مدد کرنا، بھٹکے ہوئے کو رستہ دکھانا

میرے بعد تم اپنا خیال رکھنا
اے جگنو سی لڑکی!
تیرے دن ہیں مسکرانے کے
دُکھوں سے دور جانے کے
تم ابھی محبت مت کرنا
جذبوں کو کسی پر ضائع مت کرنا
دن میں چاند ستارے نظر آتے نہیں
بچھڑیں جو ایک بار ملتے نہیں کبھی

نور کو ایک بار پھر ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ آسیہ نے نور کا death certificate بنواتے وقت اپنا اثر دِکھاتے ہوئے ہسپتال انتظامیہ کو مجبور کیا کہ نور کی موت کا سبب COVID نہ لکھا جائے بلکہ اسے شدید ذہنی صدمہ قرار دیا جائے۔ آسیہ کی بات مان لی گئی تھی جسے وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تصور کرنے میں پر تھی!!!!!

جل بھی چکے پروانے ہو بھی چکی رسوائی
اب خاک اڑانے کو بیٹھے ہیں تماشائی
تاروں کی ضیاء دل میں اک آگ لگاتی ہے
آرام سے راتوں کو سوتے نہیں سودائی
راتوں کی اداسی میں خاموش ہے دل میرا
بے حس ہیں تمنائیں نیند آئی کہ موت آئی
اب دل کو کسی کروٹ آرام نہیں ملتا
اک عمر کا رونا ہے دو دن کی شناسائی
اک شام وہ آئے تھے اک شام فروزاں تھی
وہ شام نہیں لوٹی وہ رات نہیں آئی
اب تو وسعتِ عالم بھی کم ہے میری وحشت کو
کیا مجھ کو رُلائے گی اس دشت کی پنہائی
جی میں ہے اس در سے، اب ہم نہیں اٹھیں گے
جس در پہ نہ جانے کئی سو بار قسم کھائی
اب محفلِ دنیا میں کوئی بھی نہیں رہتا
شہزاد ہوئے بے دم کس کس کی تمنائی

(شہزاد احمد)

T & T PUBLISHERS
Bank Colony, Samanabad,
Lahore-54500 (Pakistan)
0300-4191687 / 0332-4822090